مذہب اور جدید چیلنج

مولانا وحید الدین خاں

مطبوعات اسلامی مرکز

مذہب
اور
جدید چیلنج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سنریھم ایتنا فی الآفاق و فی انفسھم

حتی یتبین لھم انہ الحق (حٰم سجدہ ۵۳)

ہم اُن کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے، کائنات میں بھی اور اُن کے

اپنے اندر بھی، یہاں تک کہ اُن پر کھل جائے یہ واقعی برحق ہے۔

مذہب اور جدید چیلنج

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

Mazhab aur Jadid Challenge
By Maulana Wahiduddin Khan

English version: *Islam and Modern Challenges*
Malay version: *Islam Menjawab Tantagan Zaman*
Malayalam version: *Islam Velluvilikkunnu*
Sindhi version: *Jadid Ilm Jo Challenge*
Turkish version: *Islam Meydan Okuyor!*
Arabic version: *Al-Islam Yatahadda*

First published in 1966
Eigth Reprint 2000

Distributed by
AL-RISALA
The Islamic Centre
1, Nizamuddin West Market,
New Delhi 110 013
Tel. 4625454, 4611128,
Fax 4697333, 4647980
e-mail: skhan@vsnl.com
website: http://www.alrisala.org

Printed by Nice Printing Press, New Delhi.

فہرست

عرضِ ناشر

فروری ۱۹۵۵ کا واقعہ ہے۔ لکھنؤ کے امین الدولہ پارک میں جماعت اسلامی ہند کے زیرِاہتمام ایک عمومی اجتماع ہوا۔ اس موقع پر اسلام کے عقلی اثبات پر مصنف کی ایک تقریر ہوئی۔ تقریر کے بعد جب اعلان کیا گیا کہ وہ چھپی ہوئی صورت میں یہاں بک اسٹال پر موجود ہے تو انسانوں کا ہجوم اس کو لینے کے لئے اسٹال پر ٹوٹ پڑا۔ تقریر کے مطبوعہ نسخے ہاٹ کیک کی طرح فروخت ہوگئے۔ بعد کو یہ تقریر پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوئی۔ اردو میں اس کا نام تھا "نئے عہد کے دروازہ پر" ہندی میں "نویگ کے پردیش دوار پر" اور انگریزی میں :

ON THE THRESHOLD OF A NEW ERA

یہ پہلا موقع تھا جب کہ مصنّف کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جدید الحاد کے جواب میں عصری انداز میں ایک کتاب تیار کرنی چاہیے۔ اس کے لئے مطالعہ اور مواد جمع کرنے کا کام اسی وقت سے شروع ہوگیا۔ اس کے بعض اجزاء متفرق طور پر بعض ماہناموں میں شائع ہوتے رہے۔ جمع شدہ مواد کی باقاعدہ کتابی ترتیب کا کام ۱۹۶۳ میں شروع ہوا اور اگست ۱۹۶۴ میں مکمّل ہوگیا۔

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۶ میں ادارہ تحقیقات و نشریاتِ اسلام (لکھنؤ) سے شائع ہوئی۔ اس کا عربی ترجمہ پہلی بار ۱۹۷۰ میں کویت کے ناشر "دار البحوث العلمیہ" نے الاسلام یتحدیٰ کے نام سے شائع کیا۔ اس کے بعد وہ بیروت اور قاہرہ سے چھپتی رہی۔ اب تک اس کے ایک درجن اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ دوسری کئی عالمی زبانوں میں بھی اس کے ترجمے چھپ چکے ہیں۔ "الاسلام یتحدیٰ" نصف درجن عرب یونیورسٹیوں میں داخلِ نصاب ہے۔

کتاب کی اشاعت کے بعد سیکڑوں تبصرے مختلف عالمی جرائد میں شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک تبصرہ جزئی طور پر ٹائٹل کے آخری صفحہ پر نقل کیا جارہا ہے۔ یہ تبصرہ معروف مصری ادیب احمد بہجت کے قلم سے ہے۔ اس کو قاہرہ کے اخبار الاہرام (۲ جولائی ۱۹۷۳) نے اپنے کالموں میں شائع کیا تھا۔

مخالفینِ مذہب کا مقدمہ

"جس طرح ایٹم کے ٹوٹنے سے مادہ کے بارے میں انسان کے پچھلے تمام تصورات ختم ہو گئے، اسی طرح پچھلی صدی میں علم کی جو ترقی ہوئی ہے، وہ بھی ایک قسم کا علمی دھماکہ (Knowledge Explosion) ہے، جس کے بعد خدا اور مذہب کے متعلق تمام پرانے خیالات بھک سے اڑ گئے ہیں"۔[1] یہ جولین ہکسلے کے الفاظ میں علم جدید کا چیلنج ہے، اور ان صفحات میں مجھے اسی چیلنج کا جواب دینا ہے، مصنف کا یقین ہے کہ علم کی روشنی مذہب کی صداقت کو اور زیادہ واضح کرنے میں مددگار ہوئی ہے، اس نے کسی بھی اعتبار سے مذہب کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے، دورِ جدید کی ساری دریافتیں صرف اس بات کا اعتراف ہیں کہ آج سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے اسلام کا یہ دعویٰ کہ وہ آخری صداقت ہے اور آئندہ کی تمام انسانی معلومات اس کی صداقت کو اور مبرہن کرتی چلی جائیں گی، بالکل صحیح تھا۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ۔[2]	عنقریب ہم دکھائیں گے اپنی نشانیاں ان کو آفاق میں اور خود ان کے اندر یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے کہ وہ حق ہے۔

[جدید بے خدا مفکرین کے نزدیک مذہب کوئی حقیقی چیز نہیں ہے، وہ انسان کی صرف اس خصوصیت

---

[1] ہندوستان ٹائمس، سنڈے میگزین، ۲۳ ستمبر ۱۹۶۱ء [2] حم سجدہ ۵۳

کا نتیجہ ہے کہ وہ کائنات کی توجیہہ کرنا چاہتا ہے، توجیہہ تلاش کرنے کا انسانی جذبہ بذاتِ خود غلط نہیں ہے مگر کم تر معلومات نے ہمارے پرانے اجداد کو ان غلط جوابات تک پہنچا دیا جس کو خدا یا مذہب کہا جاتا ہے، اب جس طرح بہت سے دوسرے معاملات میں انسان نے اپنی علمی ترقی سے ماضی کی غلطیوں کی اصلاح کی ہے، اسی طرح توجیہہ کے معاملے میں بھی وہ آج اس پوزیشن میں ہے کہ اپنی ابتدائی غلطیوں کی اصلاح کر سکے۔

آگسٹ کامٹے (August Comte) جو انیسویں صدی کے نصف اول کا فرانسیسی مفکر ہے اس کے نزدیک انسان کی فکری ارتقا کی تاریخ تین مرحلوں میں تقسیم ہے، پہلا مرحلہ الہیاتی مرحلہ (Theological Stage) ہے، جب کہ واقعات عالم کی توجیہہ خدائی طاقتوں کے حوالے سے کی جاتی ہے، دوسرا مرحلہ مابعد الطبیعیاتی مرحلہ (Metaphysical Stage) ہے جس میں متعین خدا کا نام تو باقی نہیں رہتا، پھر بھی واقعات کی توجیہہ کے لئے خارجی عناصر کا حوالہ دیا جاتا ہے، تیسرا مرحلہ ثبوتی مرحلہ (Positive Stage) ہے جبکہ واقعات کی توجیہہ ایسے اسباب کے حوالے سے کی جاتی ہے، جو مطالعہ اور مشاہدہ کے عام قوانین کے تحت معلوم ہوتے ہیں، بغیر اس کے کہ کسی روح، خدا یا مطلق طاقتوں کا نام لیا گیا ہو، اس فکر کی رو سے اس وقت ہم اسی تیسرے فکری دور سے گزر رہے ہیں اور اس فکر نے فلسفہ میں جو نام اختیار کیا ہے وہ منطقی ثبوتیت (Logical Positivism) ہے۔

منطقی ثبوتیت یا سائنسی تجربیت (Scientific Empiricism) باقاعدہ تحریک کی شکل میں بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی میں شروع ہوئی، مگر ایک طرز فکر کی حیثیت سے یہ پہلے ذہنوں میں پیدا ہو چکی تھی، اس کی پشت پر ہیوم (Hume) اور مل (Mill) سے لے کر رسل (Russel) تک درجنوں ممتاز مفکرین کے نام ہیں، اور اب ساری دنیا میں اپنے تبلیغی اور تحقیقی اداروں کے ساتھ وہ موجودہ زمانے کا اہم ترین طریق فکر بن چکا ہے۔

ڈکشنری آف فلاسفی (مطبوعہ نیویارک) میں اس طریق فکر کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں

کی گئی ہے۔

"Every knowledge that is factual is connected with experiences in such a way that verification or direct or indirect confirmation is possible."
(p. 285)

یعنی ہر وہ علم جو حقیقی ہے، وہ تجربات سے اس طور پر متعلق ہوتا ہے کہ اس کی جانچ، یا براہِ راست یا بالواسطہ طریقے سے اس کی تصدیق حاصل کرنا ممکن ہو، اس طرح مخالفین مذہب کے نزدیک صورت حال یہ بنتی ہے کہ ارتقا کے عمل نے انسان کو آج جس اعلیٰ ترین مقام تک پہنچایا ہے، وہ عین اپنے طریق فکر کے اعتبار سے مذہب کی تردید ہے، کیوں کہ جدید ارتقا یافتہ علم نے ہمیں بتایا ہے کہ حقیقت صرف وہی ہو سکتی ہے جو تجربہ اور مشاہدہ میں آئی ہو، جبکہ مذہب کی بنیاد حقیقت کے ایک ایسے تصور پر ہے جو سرے سے مشاہدے اور تجربے میں آ ہی نہیں سکتی، دوسرے لفظوں میں واقعات و حوادث کی الٰہیاتی توجیہہ ترقی یافتہ ذرائع سے ثابت نہیں ہوتی اس لئے وہ غیر حقیقی ہے۔

اس طریق فکر کے مطابق مذہب، حقیقی واقعات کی غیر حقیقی توجیہہ ہے، پہلے زمانے میں انسان کا علم چونکہ بہت محدود تھا، اس لئے واقعات کی صحیح توجیہہ میں اسے کامیابی نہیں ہوئی اور اس نے مذہب کے نام سے عجیب عجیب مفروضے قائم کر لئے، مگر ارتقا کے عالمگیر قانون نے آدمی کو اس اندھیرے سے نکال دیا ہے، اور جدید معلومات کی روشنی میں یہ ممکن ہو گیا ہے کہ اٹکل پچو عقائد پر ایمان رکھنے کے بجائے خالص تجرباتی اور مشاہداتی ذرائع سے اشیا کی حقیقت معلوم کی جائے[1]، چنانچہ وہ تمام چیزیں جن کو پہلے مافوق الطبیعی اسباب کا نتیجہ سمجھا

---

[1] "منطقی ثبوتیت کی تنقید کو دوسری طرح یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ماضی کے علمائے مذاہب کی مثال ایسے شخص کی سی ہے، جس نے ایک بیکار چیک (Dud Cheque) لکھ دیا ہو جس کے لئے بنک میں واقعی رقم موجود نہ ہو، یہ لوگ ایسے الفاظ استعمال کرتے رہے، جس کے پیچھے معنویت کا سرمایہ نہیں تھا، "ناقابل تغیر حقیقت اعلیٰ" قواعد زبان کی رو سے (باقی ص۱۶ پر)

جاتا تھا، اب بالکل فطری اسباب کے تحت ان کی تشریح معلوم کر لی گئی ہے، جدید طریق مطالعہ نے ہمیں بتا دیا ہے کہ خدا کا وجود فرض کرنا انسان کی کوئی واقعی دریافت نہیں تھی، بلکہ یہ محض دور لاعلمی کے قیاسات تھے، جو علم کی روشنی پھیلنے کے بعد خود بخود ختم ہو گئے ہیں، جولین ہکسلے لکھتا ہے:۔

"نیوٹن نے دکھا دیا ہے کہ کوئی خدا نہیں ہے، جو سیاروں کی گردش پر حکومت کرتا ہو، لاپلاس نے اپنے مشہور نظریے سے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ فلکی نظام کو خدائی مفروضہ کی کوئی ضرورت نہیں، ڈارون اور پاسچر نے یہی کام حیاتیات کے میدان میں کیا ہے، اور موجودہ صدی میں علم النفس کی ترقی اور تاریخی معلومات کے اضافے نے خدا کو اس مفروضہ مقام سے ہٹا دیا ہے کہ وہ انسانی زندگی اور تاریخ کو کنٹرول کرنے والا ہے۔"

Religion without Revelation, New York, 1958, p.58

یعنی طبیعیات، نفسیات اور تاریخ، تینوں علوم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جن واقعات کی توجیہ کے لئے پچھلے انسان نے خدا اور دیوتا کا وجود فرض کر لیا تھا، یا مجرد طاقتوں کو ماننے لگا تھا، اس کے اسباب دوسرے تھے، مگر ناواقفیت کی وجہ سے وہ مذہب کی پراسرار اصطلاحوں میں بات کرتا رہا۔

۱۔ طبیعیاتی دنیا میں اس انقلاب کا ہیرو نیوٹن ہے، جس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ کائنات کچھ ناقابل تغیر اصولوں میں بندھی ہوئی ہے، کچھ قوانین ہیں، جن کے تحت تمام اجرام سماوی حرکت کر رہے ہیں، بعد کو دوسرے بے شمار لوگوں نے اس تحقیق کو آگے بڑھایا، یہاں تک کہ زمین سے لے کر آسمان تک سارے واقعات ایک اٹل نظام کے تحت ظاہر ہوتے ہوئے نظر آئے جس کو قانون فطرت (Law of Nature) کا نام دیا گیا، اس دریافت کے بعد قدرتی طور پر یہ تصور ختم ہو جاتا ہے کہ کائنات کے پیچھے کوئی فعال اور قادر خدا

(باقی صفحہ ۱۵ کا) ایک صحیح جملہ ہے، مگر وہ ایک بے کار چک ہے جس کے پیچھے کوئی حقیقی سرمایہ نہیں۔"

Religion and the Scientific Outlook, p.20.

ہے، جو اس کو چلا رہا ہے، زیادہ سے زیادہ گنجائش اگر ہو سکتی ہے تو ایسے خدا کی جس نے ابتداً کائنات کو حرکت دی ہو، چنانچہ شروع میں لوگ محرکِ اول کے طور پر خدا کو مانتے رہے، والٹیر نے کہا کہ خدا نے اس کائنات کو بالکل اسی طرح بنایا ہے، جس طرح ایک گھڑی ساز گھڑی کے پرزے جمع کر کے انھیں ایک خاص شکل میں ترتیب دے دیتا ہے، اور اس کے بعد گھڑی کے ساتھ اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا، اس کے بعد ہیوم نے اس "بے جان اور بے کار خدا" کو بھی یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ ہم نے گھڑیاں بنتے ہوئے تو دیکھی ہیں، لیکن دنیا میں بنتی ہوئی نہیں دیکھیں، اس لئے کیوں کر ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم خدا کو مانیں۔

سائنس کی ترقی اور علم کے پھیلاؤ نے اب انسان کو وہ کچھ دکھا دیا ہے، جس کو پہلے اس نے دیکھا نہیں تھا، واقعات کی جن کڑیوں کو نہ جاننے کی وجہ سے ہم سمجھ نہیں سکتے تھے، کہ یہ واقعہ کیوں ہوا، وہ اب واقعات کی تمام کڑیوں کے سامنے آجانے کی وجہ سے ایک جانی بوجھی چیز بن گیا ہے، مثلاً پہلے آدمی یہ نہیں جانتا تھا کہ سورج کیسے نکلتا اور کیسے ڈوبتا ہے، اس لئے اس نے سمجھ لیا کہ کوئی خدا ہے جو سورج کو نکالتا ہے، اور اس کو غروب کرتا ہے، اس طرح ایک مافوق الفطری طاقت کا خیال پیدا ہوا، اور جس چیز کو آدمی نہیں جانتا تھا، اس کے متعلق یہ کہہ دیا کہ یہ اسی طاقت کا کرشمہ ہے، مگر اب جب کہ ہم جانتے ہیں کہ سورج کا نکلنا اور ڈوبنا اس کے گرد زمین کے گھومنے کی وجہ سے ہوتا ہے، تو سورج کو نکالنے اور غروب کرنے کے لئے خدا کو ماننے کی کیا ضرورت! اسی طرح وہ تمام چیزیں جن کے متعلق پہلے سمجھا جاتا تھا کہ ان کے پیچھے کوئی اَن دیکھی طاقت کام کر رہی ہے، وہ سب جدید مطالعہ کے بعد ہماری جانی پہچانی فطری طاقتوں کے عمل اور ردِ عمل کا نتیجہ نظر آیا ــــــ گویا واقعہ کے فطری اسباب معلوم ہونے کے بعد وہ ضرورت آپ سے آپ ختم ہو گئی جس کے لئے پہلے لوگوں نے ایک خدا یا مافوق الفطری طاقت کا وجود فرض کر لیا تھا: "اگر قوسِ قزح گرتی ہوئی بارش پر سورج کی شعاعوں کے انعطاف (Refraction) سے پیدا ہوتی ہے تو یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ وہ آسمان کے اوپر خدا کا نشان ہے" ــــــ ہکسلے اس قسم کے واقعات

پیش کرتا ہوا کس قدر یقین کے ساتھ کہتا ہے۔

"If events are due to natural causes, they are not due to supernatural causes."

J. Huxley, *Religion without Revelation*

یعنی واقعات اگر فطری اسباب کے تحت صادر ہوتے ہیں تو وہ مافوق الفطری اسباب کے پیدا کئے ہوئے نہیں ہو سکتے۔

۲۔ اس کے بعد نفسیات کی تحقیق کی گئی تو اس نقطۂ نظر پر مزید یقین حاصل ہو گیا کیوں کہ اس سے معلوم ہوا کہ مذہب، انسان کے اپنے لاشعور کی پیداوار ہے نہ کہ فی الواقع کسی خارجی حقیقت کا انکشاف، ایک عالم کے الفاظ میں:

"God is nothing but a projection of man on a cosmic screen."

یعنی خدا کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ کائناتی سطح پر انسان کی ہستی کا ایک خیالی انعکاس ہے، دوسری دنیا کا عقیدہ، انسان کی اپنی آرزوؤں کی ایک خوبصورت تصویر (Beautiful Idealisation of Human Wishes) سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا، وحی والہام محض بچپن میں دبے ہوئے خیالات (Childhood Repressions) کا ایک غیر معمولی اظہار ہیں۔

ان تمام خیالات کی بنیاد نظریۂ لاشعور پر قائم ہے، جدید تحقیق سے معلوم ہوا کہ انسان کا ذہن دو بڑے خانوں پر منقسم ہے، ایک خانہ وہ جس کو شعور کہتے ہیں، یہ ہمارے ان افکار کا مرکز ہے جو عام طور پر ہوش و حواس کی حالت میں شعوری طور پر ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، دوسرا خانہ لاشعور ہے، اس حصۂ ذہن کے خیالات عام طور پر ہمارے علم و حافظہ کے سامنے نہیں ہوتے مگر وہ اس کی تہ میں موجود رہتے ہیں،

لہ *The Iqbal Review*, (Lahore), April, 1962

اور غیر معمولی حالات میں یا سوتے وقت خواب میں ظاہر ہوتے ہیں، انسان کے بیشتر خیالات اسی لاشعور کے خانے میں جاکر دفن ہو جاتے ہیں، اور اس اعتبار سے ذہن کا شعوری حصہ اس کے لاشعور سے بہت کم ہے، چنانچہ دونوں کا تناسب ظاہر کرنے کے لئے سمندر کے برفانی تودہ (Iceberg) کی مثال دی جاتی ہے، جس کے نو حصے کئے جائیں تو آٹھ حصے پانی میں ڈوبے ہوئے ہوں گے اور صرف ایک حصہ اوپر دیکھنے والوں کو نظر آئے گا (اگرچہ یہ تناسب بھی اضافی ہے)

فرائڈ نے طویل تحقیق کے بعد انکشاف کیا کہ بچپن میں انسان کے لاشعور میں کچھ ایسی چیزیں بیٹھ جاتی ہیں، جو بعد میں غیر عقلی رویے کا باعث بنتی ہیں، یہی صورت مذہبی عقائد کی ہے، مثلاً دوسری دنیا اور جنت دوزخ کا تصور دراصل ان آرزوؤں کی صدائے بازگشت ہے، جو بچپن میں آدمی کے ذہن میں پیدا ہوئیں، مگر حالات سازگار نہ ہونے کی وجہ سے پوری نہیں ہوئیں اور دب کر لاشعور میں باقی رہ گئیں، بعد کو لاشعور نے اپنی تسکین کے لئے ایک ایسی دنیا فرض کر لی جہاں وہ اپنی آرزوؤں کی تکمیل کر سکے گا، بالکل اسی طرح جیسے کوئی شخص اپنی ایک محبوب چیز کو واقعی دنیا میں نہ پا سکا ہو تو وہ نیند کی حالت میں خواب دیکھتا ہے کہ وہ اس سے ہم کنار ہو رہا ہے، اسی طرح بچپن کی بہت سی باتیں جو لاشعور میں تہ نشیں ہو کر بظاہر حافظہ سے نکل گئی تھیں، وہ غیر معمولی حالات مثلاً جنون یا ہسٹریا میں یکایک زبان پر جاری ہو گئیں تو سمجھ لیا گیا کہ یہ کوئی ماورائی طاقت ہے جو انسان کی زبان سے کلام کر رہی ہے، اسی طرح بڑے اور چھوٹے کے فرق اور (Father Complex) نے خدا اور بندے کا تصور پیدا کیا، اور جو چیز محض ایک سماجی برائی تھی، اس کو کائناتی سطح پر رکھ کر ایک نظریہ گڑھ لیا گیا، لنٹن (Ralph Linton) لکھتا ہے:۔

"ایک ایسے قادر مطلق کا تصور جس کے کام خواہ کتنے ہی غیر منصفانہ معلوم ہوں مگر وہ مکمل فرمانبرداری اور وفاداری ہی کے ذریعہ خوش کیا جا سکتا ہے، براہ راست سامی عائلی نظام کی پیداوار تھا، اس عائلی نظام نے مبالغہ آمیز فوق الفطری انانیت کو جنم دیا، اس کا نتیجہ نکلا کہ

قانون موسوی کی شکل میں انسانی زندگی اور رویہ کے ہر پہلو کے متعلق محرمات کی ایک مفصل فہرست تیار ہو گئی، محرمات کا یہ سلسلہ ان لوگوں نے گرہ میں باندھ لیا جو بچپن میں اپنے باپ کے احکام کو یاد رکھنے اور احتیاط سے اس پر عمل کرنے کے عادی ہو چکے تھے، خدا کا تصور مخصوص قسم کے سامی باپ کا پرتو ہے، جس کے اختیارات اور اوصاف میں تجرد اور مبالغہ پیدا کر دیا گیا ہے"

The Tree of Culture, Ralph Linton
New York, Alfred A. Knopf, 1956, P. 288

۳- مذہب کے خلاف مقدمے کی تیسری بنیاد تاریخ ہے، مخالفین مذہب کا دعویٰ ہے کہ ہم نے تاریخ کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ مذہبی تصورات پیدا ہونے کی وجہ وہ مخصوص تاریخی حالات ہیں، جو اس سے پہلے انسان کو گھیرے ہوئے تھے، قدیم زمانے میں سائنس کی دریافتوں سے پہلے سیلاب، طوفان اور بیماری وغیرہ سے بچنے کا انسان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا، وہ مستقل طور پر اپنے آپ کو غیر محفوظ زندگی میں پاتا تھا، اس لئے اس نے اپنی تسکین کے لئے کچھ ایسی غیر معمولی طاقتیں فرض کر لیں جن کو وہ مصیبت کے وقت پکارے اور جن سے دفعِ بلا کی امید رکھے، اسی طرح سماج کے اندر باہمی پیوستگی پیدا کرنے اور ایک مرکز کے گرد لوگوں کو جوڑے رکھنے کے لئے بھی کسی چیز کی ضرورت تھی، یہ کام اس نے ایسے معبودوں سے لیا جو سارے انسانوں کے اوپر ہوں اور جن کی مرضی حاصل کرنا ہر ایک کے لئے ضروری ہو، وغیرہ وغیرہ، علوم اجتماعی کی انسائیکلوپیڈیا میں مذہب (Religion) کا مقالہ نگار لکھتا ہے:-

"جس طرح دوسرے اسباب مذہب کو پیدا کرنے میں اثرانداز ہوئے ہیں، اسی طرح اس میں سیاسی اور تمدنی حالات کا بھی دخل رہا ہے، خداؤں کے نام اور ان کی صفات خود بخود وقت کے نظام سلطنت کی صورت میں ڈھل گئے، خدا کو بادشاہ ماننے کا عقیدہ محض انسانی بادشاہت کی بدلی ہوئی شکل ہے، اور آسمانی بادشاہت صرف زمینی بادشاہت کا ایک چربہ ہے، نیز چونکہ بادشاہ سب سے بڑا جج بھی ہوتا تھا، اسی طرح خدا کو بھی عدالت کی کارروائیاں سپرد کر دی گئیں اور یہ عقیدہ بن گیا کہ وہ

انسان کی بدی یا نیکی کے بارے میں آخری فیصلہ کرے گا، اس قسم کا عدالتی تصور جو خدا کو محاسب اور مجازی مانتا ہے، اس نے نہ صرف یہودیت میں بلکہ عیسائیت اور اسلام کے مذہبی نقطۂ نظر میں بھی مرکزی مقام حاصل کر لیا ہے۔"

Encyclopaedia of Social Sciences, 1957, Vol. 13, p.233

اس طرح مخصوص تاریخی دور کے حالات اور ان حالات کے ساتھ انسانی ذہن کے باہمی تعامل نے وہ تصورات پیدا کئے، جن کو مذہب کہا جاتا ہے "مذہب انسانی ذہن کی پیداوار ہے جو عدم واقفیت اور خارجی قوتوں کے مقابلے میں بے سہارا ہونے کی ایک خاص حالت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے" جولین ہکسلے یہ ریمارک دیتا ہوا لکھتا ہے

"Religion is the product of a certain type of interaction between man and his environment".

Man in the Modern World, p. 130

یعنی مذہب نتیجہ ہے، انسان اور اس کے ماحول کے درمیان ایک خاص طرح کے تعامل کا، اب چونکہ وہ مخصوص ماحول ختم ہو گیا ہے، یا کم از کم ختم ہو رہا ہے، جو اس طرح کے تعامل کو وجود میں لانے کا ذمہ دار تھا، اس لئے اب مذہب کو زندہ رکھنے کی بھی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی، وہ مزید لکھتا ہے:۔

"خدا کا تصور اپنی افادیت کے آخری مقام پر پہنچ چکا ہے، اب وہ مزید ترقی نہیں کر سکتا۔ مافوق الفطری طاقتیں دراصل مذہب کا بوجھ اٹھانے کے لئے انسانی ذہن نے اختراع کی تھیں، پہلے جادو پیدا ہوا، پھر روحانی تصرفات نے اس کی جگہ لی، پھر دیوتاؤں کا عقیدہ ابھرا اور اس کے بعد ایک خدا کا تصور آیا، اس طرح ارتقائی مراحل سے گزر کر مذہب اپنی آخری حد کو پہنچ کر ختم ہو چکا ہے کسی وقت یہ خدا ہماری تہذیب کے ضروری مفروضے اور مفید تخیلات تھے، مگر اب جدید ترقی یافتہ سماج میں وہ اپنی ضرورت اور افادیت کھو چکے ہیں۔" (صفحہ ۱۳۱)

اشتراکی فلسفہ کے نزدیک بھی مذہب ایک تاریخی فریب ہے، البتہ اشتراکیت چونکہ تاریخ کا مطالعہ تمام تر اقتصادیات کی روشنی میں کرتی ہے، اس لئے اس نے تمام تاریخی اسباب کو سمیٹ کر صرف اقتصادی اسباب میں مرکوز کر دیا۔ اس کے نزدیک مذہب کو جن تاریخی حالات نے پیدا کیا وہ دورِ قدیم کا جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام تھا، اب چونکہ یہ فرسودہ نظام اپنی موت مر رہا ہے، اس لئے مذہب کو بھی اسی کے ساتھ ختم سمجھنا چاہئے، انگلس کے الفاظ میں "تمام اخلاقی نظریے، اپنے آخری تجزیے میں، وقت کے اقتصادی حالات کی پیداوار ہیں"[1] "انسانی تاریخ طبقاتی لڑائیوں کی تاریخ ہے، جس میں سربرآوردہ طبقہ، پسماندہ طبقہ کا استحصال کرتا رہا ہے، اور مذہب و اخلاق صرف اس لئے وضع کئے گئے" تاکہ سربرآوردہ طبقہ کے مفادات کو محفوظ کرنے کے لئے نظریاتی بنیاد حاصل ہو سکے۔

"قانون، اخلاق، مذہب، سب بورژوا کی فریب کاری ہے، جس کی آڑ میں اس کے بہت سے مفادات چھپے ہوئے ہیں" (کمیونسٹ مینی فسٹو)

نوجوان کمیونسٹ لیگ کی تیسری کل روس کانگرس (اکتوبر ۱۹۲۰ء) میں لینن نے کہا تھا:۔

"یقیناً ہم خدا کو نہیں مانتے، ہم خوب جانتے ہیں کہ اربابِ کلیسا، زمیندار اور بورژوا طبقہ جو خدا کے حوالے سے کلام کرتے ہیں وہ محض استحصال کرنے والے کی حیثیت سے اپنے مفادات کا تحفظ کرنا چاہتے ہیں، ہم ایسے تمام اخلاقی ضابطوں کا انکار کرتے ہیں، جو انسانوں سے ماورا کسی مافوق طاقت سے اخذ کئے گئے ہوں یا طبقاتی تصور پر مبنی نہ ہوں، ہم کہتے ہیں کہ یہ ایک دھوکا ہے، ایک فریب ہے، زمینداروں اور سرمایہ داروں کے مفاد کے لئے مزدوروں اور کسانوں کی فکر پر پردہ ڈالنا (Befogging of the Minds) ہے، ہم کہتے ہیں کہ ہمارا ضابطۂ اخلاق تمام تر صرف پرولتاریہ کی طبقاتی جدوجہد کے تابع ہے، ہمارے اخلاقی اصول کا ماخذ پرولتاریہ کی

[1] Antzs Duhring, Moscow, 1954, p.131

طبقاتی جدوجہد کا مفاد ہے:۔ (لینن سلکٹڈ ورکس (ماسکو ۱۹۴۷ء) جلد ۲ صفحہ ۶۶۷)

یہ ہے مخالفین مذہب کا وہ مقدمہ جس کی بنیاد پر دور جدید کے بہت سے لوگ، عضویات کے ایک امریکی پروفیسر کے الفاظ میں کہتے ہیں:۔

Science has shown religion to be history's cruelest and wickedest hoax.

یعنی سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ مذہب تاریخ کا سب سے زیادہ دردناک اور سب سے بدترین ڈھونگ تھا۔[1]

---

[1] Quoted by C.A. Coulson, *Science and Christian Belief*, p.4

تبصرہ

پچھلے صفحات میں ہم نے ان مخالف مذہب استدلالات کا ذکر کیا ہے، جو اس بات کے ثبوت کے لئے پیش کئے جاتے ہیں کہ دورِ جدید نے مذہب کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رکھی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ محض ایک بے بنیاد دعویٰ ہے، جدید طریقِ فکر نے مذہب کو کسی بھی درجہ میں کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے، اگلے ابواب میں ہم مذہب کے بنیادی تصورات کو ایک ایک کرکے لیں گے اور دکھائیں گے کہ کس طرح مذہب آج بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے، جیسے کہ وہ پہلے تھا، یہاں گزشتہ دلائل پر ایک عمومی تبصرہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس دلیل کو لیجئے، جو طبیعیاتی تحقیق کے حوالے سے پیش کی گئی ہے، یعنی کائنات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوا کہ یہاں جو واقعات ہو رہے ہیں، وہ ایک متعین قانون فطرت کے مطابق ہو رہے ہیں، اس لئے ان کی توجیہہ کرنے کے لئے کسی نامعلوم خدا کا وجود فرض کرنے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ معلوم قوانین خود اس کی توجیہہ کے لئے موجود ہیں، اس استدلال کا بہترین جواب وہ ہے جو ایک عیسائی عالم نے دیا ہے، اس نے کہا۔

"Nature is a fact, not an explanation."

یعنی فطرت کا قانون کائنات کا ایک واقعہ ہے، وہ کائنات کی توجیہہ نہیں ہے، تمہارا یہ کہنا صحیح ہے کہ ہم نے فطرت کے قوانین معلوم کرلئے ہیں، مگر تم نے جو چیز معلوم کی ہے وہ اس مسئلے کا جواب نہیں ہے، جس کے جواب

طور پر مذہب وجود میں آیا ہے، مذہب یہ بتاتا ہے کہ وہ اصل اسباب و محرکات کیا ہیں جو کائنات کے پیچھے کام کر رہے ہیں، جب کہ تمہاری دریافت صرف اس مسئلہ سے متعلق ہے کہ کائنات جو ہمارے سامنے کھڑی نظر آتی ہے، اس کا ظاہری ڈھانچہ کیا ہے، جدید علم جو کچھ ہمیں بتاتا ہے وہ صرف واقعات کی مزید تفصیل ہے، نہ کہ اصل واقعہ کی توجیہہ، سائنس کا سارا علم اس سے متعلق ہے کہ "جو کچھ ہے وہ کیا ہے" یہ بات اس کی دسترس سے باہر ہے کہ "جو کچھ ہے، وہ کیوں ہے" جب کہ توجیہہ کا تعلق اسی دوسرے پہلو سے ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے، مرغی کا بچہ انڈے کے مضبوط خول کے اندر پرورش پاتا ہے، اور اس کے ٹوٹنے سے باہر آتا ہے، یہ واقعہ کیوں کر ہوتا ہے کہ خول ٹوٹے اور بچہ جو گوشت کے لوتھڑے سے زیادہ نہیں ہوتا، وہ باہر نکل آئے، پہلے کا انسان اس کا جواب یہ دیتا تھا کہ "خدا ایسا کرتا ہے" مگر اب خوردبینی مشاہدہ کے بعد معلوم ہوا کہ جب ۲۱ روز کی مدت پوری ہونے والی ہوتی ہے، اس وقت ننھے بچے کی چونچ پر ایک نہایت چھوٹی سی سخت سینگ ظاہر ہوتی ہے، اس کی مدد سے وہ اپنے خول کو توڑ کر باہر آجاتا ہے، سینگ اپنا کام پورا کر کے بچہ کی پیدائش کے چند دن بعد خود بخود جھڑ جاتی ہے۔

مخالفین مذہب کے نظریے کے مطابق یہ مشاہدہ اس پرانے خیال کو غلط ثابت کر دیتا ہے کہ بچہ کو باہر نکالنے والا خدا ہے، کیونکہ خوردبین کی آنکھ ہم کو صاف طور پر دکھا رہی ہے کہ ایک ۲۱ روزہ قانون ہے جس کے تحت وہ صورتیں پیدا ہوتی ہیں، جو بچہ کو خول کے باہر لاتی ہیں، مگر یہ مغالطہ کے سوا اور کچھ نہیں، جدید مشاہدہ نے جو کچھ ہمیں بتایا ہے، وہ صرف واقعہ کی چند مزید کڑیاں ہیں، اس نے واقعہ کا اصل سبب نہیں بتایا، اس مشاہدہ کے بعد صورت حال میں جو فرق ہوا ہے، وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ پہلے جو سوال خول کے ٹوٹنے کے بارے میں تھا، وہ "سینگ" کے اوپر جا کر ٹھہر گیا، بچہ کا اپنی سینگ سے خول کو توڑنا واقعہ کی صرف ایک درمیانی کڑی ہے، وہ واقعہ کا سبب نہیں ہے، واقعہ کا سبب تو اس وقت معلوم ہوگا جب ہم جان لیں کہ بچہ کی چونچ پر سینگ کیسے ظاہر ہوئی، دوسرے لفظوں میں اس آخری سبب کا پتہ لگائیں،

جو بچہ کی اس ضرورت سے واقف تھا کہ اس کو خول سے باہر نکلنے کے لئے کسی سخت مددگار کی ضرورت ہے، اور اس نے مادہ کو مجبور کیا کہ عین وقت پر ٹھیک ۲۱ روز بعد وہ بچہ کی چونچ پر ایک ایسی سینگ کی شکل میں نمودار ہو جو اپنا کام پورا کرنے کے بعد جھڑ جائے، گویا پہلے یہ سوال تھا کہ "خول کیسے ٹوٹتا ہے" اور اب سوال یہ ہو گیا کہ "سینگ کیسے بنتی ہے" ظاہر ہے کہ دونوں حالتوں میں کوئی نوعی فرق نہیں، اس کو زیادہ سے زیادہ حقیقت کا وسیع تر مشاہدہ کہہ سکتے ہیں، حقیقت کی توجیہہ کا نام نہیں دے سکتے۔

یہاں میں ایک امریکی عالم حیاتیات (Cecil Boyce Hamann) کے الفاظ نقل کروں گا

"غذا ہضم ہونے اور اس کے جزو بدن بننے کے حیرت انگیز عمل کو پہلے خدا کی طرف منسوب کیا جاتا تھا، اب جدید مشاہدہ میں وہ کیمیائی ردِ عمل کا نتیجہ نظر آتا ہے، مگر کیا اس کی وجہ سے خدا کے وجود کی نفی ہو گئی، آخر وہ کون طاقت ہے، جس نے کیمیائی اجزاء کو پابند کیا کہ وہ اس قسم کا مفید ردِ عمل ظاہر کریں، غذا انسان کے جسم میں داخل ہونے کے بعد ایک عجیب و غریب خودکار انتظام کے تحت جس طرح مختلف مراحل سے گزرتی ہے، اس کو دیکھنے کے بعد یہ بات بالکل خارج از بحث معلوم ہوتی ہے کہ یہ حیرت انگیز انتظام محض اتفاق سے وجود میں آ گیا، حقیقت یہ ہے کہ اس مشاہدہ کے بعد تو اور زیادہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہم یہ مانیں کہ خدا اپنے ان عظیم قوانین کے ذریعہ عمل کرتا ہے، جس کے تحت اس نے زندگی کو وجود دیا ہے۔"

The Evidence of God in an Expanding Universe, p.221

اس سے آپ جدید دریافتوں کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ سائنس نے کائنات کے بارے میں انسان کے مشاہدے کو بہت بڑھا دیا ہے، اس نے دکھا دیا ہے کہ وہ کون سے فطری قوانین ہیں، جن میں یہ کائنات جکڑی ہوئی ہے، اور جس کے تحت وہ حرکت کر رہی ہے، مثلاً پہلے آدمی صرف یہ جانتا تھا کہ پانی برستا ہے، مگر اب سمندر کی بھاپ اٹھنے سے لے کر بارش کے قطرے زمین پر گرنے تک کا وہ پورا عمل انسان کو معلوم ہو گیا ہے،

جس کے مطابق بارش کا واقعہ ہوتا ہے، مگر یہ ساری دریافتیں صرف واقعہ کی تصویریں ہیں، وہ واقعہ کی توجیہہ نہیں ہیں، سائنس یہ نہیں بتاتی کہ فطرت کے قوانین کیسے قوانین بن گئے، وہ کیسے اس قدر مفید شکل میں مسلسل طور پر زمین و آسمان میں قائم ہیں اور اس صحت کے ساتھ قائم ہیں کہ ان کی بنیاد پر سائنس میں قوانین مرتب کئے جاتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ وہ فطرت جس کو معلوم کر لینے کی وجہ سے انسان یہ دعویٰ کرنے لگا ہے کہ اس نے کائنات کی توجیہہ دریافت کر لی، وہ محض دھوکا ہے، یہ ایک غیر متعلق بات کو سوال کا جواب بنا کر پیش کرنا ہے، یہ درمیانی کڑی کو آخری کڑی قرار دینا ہے، یہاں پھر میں مذکورہ عالم کے الفاظ دہراؤں گا۔

"Nature does not explain, she herself is in need of an explanation."

یعنی فطرت کائنات کی توجیہہ نہیں کرتی، وہ خود اپنے لئے ایک توجیہہ کی طالب ہے۔

اگر آپ کسی ڈاکٹر سے پوچھیں کہ خون سرخ کیوں ہوتا ہے تو وہ جواب دے گا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ خون میں نہایت چھوٹے چھوٹے سرخ اجزا ہوتے ہیں (ایک انچ کے سات ہزارویں حصے کے برابر) یہی سرخ ذرات خون کو سرخ کرنے کا سبب ہیں۔

"درست، مگر یہ ذرات سرخ کیوں ہوتے ہیں؟"

"ان ذرات میں ایک خاص مادہ ہوتا ہے، جس کا نام ہیموگلوبن (Haemoglobin) ہے، یہ مادہ جب پھیپھڑے میں آکسیجن جذب کرتا ہے تو گہرا سرخ ہو جاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، مگر ہیموگلوبن کے حامل سرخ ذرات کہاں سے آئے؟"

"وہ آپ کی تلی میں بن کر تیار ہوتے ہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب! جو کچھ آپ نے فرمایا وہ بہت عجیب ہے، مگر مجھے بتائیے کہ ایسا کیوں ہے کہ خون،

سرخ ذرات، تلی اور دوسری ہزاروں چیزیں اس طرح ایک کُل کے اندر باہم مربوط ہیں، اور اس قدر صحت کے ساتھ اپنا اپنا عمل کر رہی ہیں؟

"یہ قدرت کا قانون ہے۔"

"وہ کیا چیز ہے جس کو آپ قانون قدرت کہتے ہیں؟"

"اس سے مراد (Blind interplay of physical and chemical forces) طبیعی اور کیمیائی طاقتوں کا اندھا عمل ہے۔"

"مگر کیا وجہ ہے کہ یہ اندھی طاقتیں ہمیشہ ایسی سمت میں عمل کرتی ہیں، جو انھیں ایک متعین انجام کی طرف لے جائے، کیسے وہ اپنی سرگرمیوں کو اس طرح منظم کرتی ہیں کہ ایک چڑیا اڑنے کے قابل ہو سکے، ایک مچھلی تیر سکے، ایک انسان اپنی مخصوص صلاحیتوں کے ساتھ وجود میں آئے؟"

"میرے دوست مجھ سے یہ نہ پوچھو، سائنس داں صرف یہ بتا سکتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ کیا ہے، اس کے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیوں ہو رہا ہے۔"

یہ سوال و جواب واضح کر رہا ہے کہ سائنسی دریافتوں کی حقیقت کیا ہے، بلاشبہ سائنس نے ہم کو بہت سی نئی نئی باتیں بتائی ہیں، مگر مذہب جس سوال کا جواب ہے، اس کا ان دریافتوں سے کوئی تعلق نہیں، اس قسم کی دریافتیں اگر موجودہ مقدار کے مقابلے میں اربوں کھربوں گنا بڑھ جائیں، جب بھی مذہب کی ضرورت باقی رہے گی، کیوں کہ یہ دریافتیں صرف ہونے والے واقعات کو بتاتی ہیں، یہ واقعات کیوں ہو رہے ہیں اور ان کا آخری سبب کیا ہے، اس کا جواب ان دریافتوں کے اندر نہیں ہے، یہ تمام کی تمام دریافتیں صرف درمیانی تشریح ہیں، جبکہ مذہب کی جگہ لینے کے لئے ضروری ہے کہ وہ آخری اور کلی تشریح دریافت کرے، اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی مشین کے اوپر ڈھکن لگا ہوا ہو تو ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ چل رہی ہے، اگر ڈھکن اتار دیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ باہر کا چکر کس طرح ایک اور چکر سے چل رہا ہے، اور وہ چکر کس طرح دوسرے

بہت سے پرزوں سے مل کر حرکت کرتا ہے، یہاں تک کہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس کے سارے پرزوں اور اس کی پوری حرکت کو دیکھ لیں، مگر کیا اس علم کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے مشین کے خالق اور اس کے سبب حرکت کا راز بھی معلوم کر لیا، کیا کسی مشین کی کارکردگی کو جان لینے سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ خود بخود بن گئی ہے اور اپنے آپ چلی جا رہی ہے اگر ایسا نہیں ہے تو کائنات کی کارکردگی کی بعض جھلکیاں دیکھنے سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ یہ سارا کارخانہ اپنے آپ قائم ہوا، اور اپنے آپ چلا جا رہا ہے، ہیریز (A.Harris) نے یہی بات کہی تھی جب اس نے ڈاروِنزم پر تنقید کرتے ہوئے کہا۔

> "Nature selection may explain the survival of the fittest, but cannot explain the arrival of the fittest."
>
> *Revolt Against Reason* by A. Lunn, p.133

یعنی انتخاب طبیعی کے قانون کا حوالہ صرف زندگی کے بہتر مظاہر کے باقی رہنے کی توجیہ کرتا ہے، وہ یہ نہیں بتاتا کہ یہ بہتر زندگیاں خود کیسے وجود میں آئیں۔

۲۔ اب نفسیاتی استدلال کو لیجئے، کہا جاتا ہے کہ خدا اور دوسری دنیا کا تصور کوئی حقیقی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ انسانی شخصیت اور انسانی آرزوؤں کو کائناتی سطح پر قیاس کرنا ہے، لیکن میرے لئے ناقابل تصور ہے کہ اس میں استدلال کا پہلو کیا ہے، اس کے جواب میں اگر میں کہوں کہ فی الواقع انسانی شخصیت اور انسانی آرزوئیں کائناتی سطح پر موجود ہیں تو مجھے نہیں معلوم کہ مخالفین کے پاس وہ کون سی حقیقی معلومات ہیں جن کی بنیاد پر وہ اس کی تردید کر سکیں گے۔

ہم جانتے ہیں کہ جنین کا خوردبینی مادہ چھ فٹ لمبے چوڑے انسان کی سطح پر ایک شخص کی موجودگی کی پیشین گوئی ہے، ناقابل مشاہدہ ایٹم میں وہ نظام پایا جاتا ہے، جو شمسی نظام کی سطح پر اربوں میل کے

دائرے میں گردش کر رہا ہے، پھر وہ شعور جس کا ہم انسان کی صورت میں تجربہ کر رہے ہیں، وہ اگر کائناتی سطح پر زیادہ مکمل حالت میں موجود ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے، اسی طرح ہمارا ضمیر اور ہماری فطرت جس ارتقا یافتہ دنیا کو چاہتے ہیں وہ اگر ایک ایسی دنیا کی بازگشت ہو جو فی الواقع کائنات کے پردہ میں موجود ہے تو اس میں آخر استحالہ کا کیا پہلو ہے۔

الف۔ علمائے نفسیات کا یہ کہنا بجائے خود صحیح ہے کہ بچپن میں بعض اوقات ایسی باتیں ذہن میں پڑ جاتی ہیں جو بعد کو غیر معمولی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں، مگر اس سے یہ استدلال کرنا کہ انسان کی یہی وہ خصوصیت ہے جس نے مذہب کو پیدا کیا، بالکل بے بنیاد قیاس ہے، یہ ایک معمولی واقعہ سے غیر معمولی نتیجہ اخذ کرنا ہے، یہ ایسی ہی بات ہے، جیسے میں کسی کمہار کو مٹی کی مورت بناتے ہوئے دیکھوں تو پکار اٹھوں کہ بس یہی وہ شخص ہے، جو ذی روح انسان کا خالق ہے، کمہار بیشک مٹی کے کھلونوں کا صانع ہے، مگر یہ کہنا کہ اسی طرح کوئی اور کمہار تھا جس نے خود اس کمہار کو بنایا، ایک لغو بات کے سوا اور کچھ نہیں۔

جدید طرزِ فکر کی یہ عام کمزوری ہے کہ وہ معمولی واقعہ سے غیر معمولی استدلال کرتا ہے، حالانکہ منطقی اعتبار سے اس استدلال میں کوئی وزن نہیں، اگر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص لاشعور میں دبے ہوئے خیالات کے تحت کبھی "غیر معمولی" باتیں بڑبڑانے لگتا ہے، تو اس سے یہ کہاں ثابت ہو گیا کہ انبیاء کی زبان سے کائنات کے جس علم کا انکشاف ہوا ہے، وہ بھی اسی قسم کی ایک بڑبڑاہٹ ہے، پہلے واقعہ کو تسلیم کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس سے دوسرے واقعہ کے بارے میں استدلال کرنا ایک غیر علمی اور غیر منطقی روش کا مظاہرہ کرنا ہے، یہ صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ توجیہہ کرنے والے کے پاس نبی کے غیر معمولی کلام کو سمجھنے کے لئے کوئی اور معیار موجود نہیں تھا، اس کو ایک ہی بات معلوم تھی —— یہ کہ بعض مرتبہ کوئی شخص خواب یا جنون یا بے ہوشی کی حالت میں کچھ ایسی باتیں زبان سے نکالنے لگتا ہے جو عام طور پر ہوش کی حالت میں کسی کی زبان سے ادا نہیں ہوتیں، اس نے فوراً کہہ دیا کہ بس یہی وہ چیز ہے جو مذہبی قسم کی باتوں کی ذمہ دار ہے،

حالانکہ کسی کے پاس حقیقت کو ناپنے کا ایک ہی معیار ہو تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بطور واقعہ بھی حقیقت کو ناپنے کا ایک ہی معیار ہوگا۔

فرض کیجئے، دور کے کسی سیارہ سے ایک ایسی مخلوق زمین پر اترتی ہے، جو سنتی تو ہے مگر بولنا نہیں جانتی، وہ صرف سماعت کی صفت سے آشنا ہے، تکلم کی صفت کی اسے کوئی خبر نہیں ہے، وہ انسان کی گفتگو اور تقریریں سن کر یہ تحقیق شروع کرتی ہے کہ "آواز" کیا ہے، اور کہاں سے آتی ہے، اس تحقیق کے دوران اس کے سامنے یہ منظر آتا ہے کہ درخت کی دو شاخیں جو باہم ملی ہوئی تھیں، اتفاقاً ہوا چلی اور رگڑ سے ان میں آواز نکلنے لگی، پھر جب ہوا رکی تو آواز بند ہوگئی، یہ واقعہ بار بار اس کے سامنے آتا ہے، اب ان میں کا ایک "ماہر" بغور اس کا مطالعہ کرنے کے بعد اعلان کرتا ہے کہ کلام انسانی کا راز معلوم ہو گیا، اصل بات یہ ہے کہ انسان کے منھ میں نیچے اور اوپر کے جبڑوں میں دانت کی موجودگی اس کا سبب ہے، جب یہ نیچے اوپر کے دانت باہم رگڑ کھاتے ہیں تو ان سے آواز نکلتی ہے، اور اسی کو کلام کہا جاتا ہے —— دو چیزوں کی رگڑ سے ایک قسم کی آواز پیدا ہونا بجائے خود ایک واقعہ ہے، مگر اس واقعہ سے کلام انسانی کی تشریح کرنا جس طرح صحیح نہیں ہے، اسی طرح غیر معمولی حالات میں لاشعور سے نکلی ہوئی باتوں سے کلام نبوت کی تشریح نہیں کی جا سکتی۔

ب۔ لاشعور میں جو خیالات دبا دیئے جاتے ہیں وہ اکثر اوقات ایسی ناپسندیدہ خواہشیں ہوتی ہیں، جو خاندان اور سماج کے خوف سے پوری نہیں ہو سکیں، مثلاً کسی کے اندر اپنی بہن یا لڑکی کے ساتھ جنسی جذبہ پیدا ہو تو وہ اس خیال سے اسے دبا دیتا ہے کہ اس کا ظاہر کرنا رسوائی کا باعث ہوگا، اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ شاید اس کے ساتھ شادی کرنا پسند کرتا، کسی کو قتل کرنے کا خیال ہو تو آدمی اس کو اس ڈر سے اپنے ذہن میں دفن کر دیتا ہے کہ اس کو جیل جانا پڑے گا، وغیرہ وغیرہ، گویا لاشعور میں دبی ہوئی خواہشیں اکثر اوقات وہ برائیاں ہوتی ہیں، جو ماحول کے خوف سے بروئے کار نہ آسکیں، اب اگر ایسے کسی شخص میں ذہنی اختلال (Mental Disorder) پیدا ہو اور اس کا لاشعور ظاہر ہونا شروع کرے تو اس سے کیا ظاہر ہوگا، ظاہر ہے کہ وہی برے جذبات اور غلط

خواہشیں اس کی زبان سے نکلیں گی جو اس کے لاشعور میں بھری ہوئی تھیں، وہ شر کا پیغمبر ہوگا، خیر کا پیغمبر نہیں ہو سکتا، اس کے برعکس انبیاء کی زبان سے جس مذہب کا ظہور ہوا ہے، وہ سرتاپا خیر اور پاکیزگی ہے، ان کا کلام اور ان کی زندگی خیر اور پاکیزگی کا اتنا اعلیٰ نمونہ ہے کہ انبیاء کے سوا کہیں اس کی مثال نہیں ملتی، یہی نہیں بلکہ ان کے خیالات میں اتنی کشش ہوتی ہے کہ وہی سماج جس کے خوف سے انھوں نے کبھی اپنے یہ خیالات اپنے ذہن میں چھپائے تھے، وہ اس پر دل و جان سے فریفتہ ہو جاتا ہے، اور صدیوں پر صدیاں گزر جاتی ہیں پھر بھی انھیں نہیں چھوڑتا۔

ج ۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے انسان کا لاشعور اصلاً خلا (Vacuum) ہے، اس میں پہلے سے کوئی چیز موجود نہیں ہوتی بلکہ شعور کی راہ سے گزر کر پہنچتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ لاشعور صرف انھیں واردات اور معلومات کا گودام ہے، جو کبھی انسان کے علم میں آیا ہو، وہ نامعلوم حقائق کا خزانہ نہیں بن سکتا، لیکن یہ حیرت انگیز بات ہے کہ انبیاء کی زبان سے جس مذہب کا اعلان ہوا ہے، وہ ایسی حقیقتوں پر مشتمل ہے، جو وقتی نہیں، دائمی ہیں، وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جو نہ تو انھیں پہلے سے معلوم تھیں نہ ان کے وقت تک پوری نسل انسانی کو معلوم ہو سکی تھیں، اگر ان حقائق کا سرچشمہ لاشعور ہوتا تو وہ ہرگز ایسے نامعلوم حقائق کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔

انبیا کی زبان سے جس مذہب کا اظہار ہوا ہے اس میں فلکیات، طبیعیات، حیاتیات، نفسیات، تاریخ، تمدن، سیاست، معاشرت، غرض سارے ہی علوم کسی نہ کسی اعتبار سے مَس ہوتے ہیں، ایسا ہمہ گیر کلام لاشعور تو درکنار شعور کے تحت بھی اب تک کسی انسان سے ظاہر نہیں ہوا جس میں غلط فیصلے، خام اندازے، غیر واقعی بیانات اور ناقص دلائل موجود نہ ہوں، مگر مذہبی کلام حیرت انگیز طور پر اس قسم کے تمام اغلاط سے بالکل پاک ہے، وہ اپنی دعوت، اپنے استدلال اور اپنے فیصلوں میں تمام انسانی علوم کو چھوتا ہے، مگر سیکڑوں، ہزاروں برس گزر جاتے ہیں، اگلی نسلوں کی تحقیق پچھلی نسلوں کے خیالات کو بالکل بے بنیاد ثابت کر دیتی ہے، مگر مذہب کی صداقت پھر بھی باقی رہتی ہے، آج تک حقیقی معنوں میں اس کے اندر کسی غلطی کی نشاندہی نہ ہو سکی اگر کسی نے

ایسی جرأت کی ہے تو وہ خود ہی غلط کار ثابت ہوا ہے۔

میں ایک کتاب (۱۹۳۵) کی مثال دیتا ہوں جس میں ایک ماہر فلکیات نے انتہائی یقین کے ساتھ اس بات کا اظہار کیا ہے کہ اس نے قرآن میں ایک فنی غلطی ڈھونڈ نکالی ہے، جیمز ہنری بریسٹڈ (James Henry Breasted) لکھتا ہے:

"مغربی ایشیا کی قوموں میں طویل مدت کے رواج اور خاص طور پر اسلام کے غلبہ نے قمری کیلنڈر کو دنیا بھر میں رائج کر دیا، قمری اور شمسی سال کے درمیان فرق کو محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اس انتہائی لغو حد تک لے گئے، جو کہ تصور کیا جا سکتا ہے، وہ کیلنڈر کے مسائل کی نوعیت سے اتنا زیادہ بے خبر تھے کہ قرآن میں باضابطہ انھوں نے کبیسہ کے مہینے Intercalary Months کا ٹھہرانا ممنوع قرار دے دیا، ۳۵۴ دنوں کا نام نہاد قمری سال شمسی سال سے گیارہ دن کم ہوتا ہے، اس لئے وہ اپنی گردش میں ہر ۳۲ سال میں ایک سال اور ہر ایک صدی میں تین سال زیادہ ہو جاتا ہے، ایک ماہانہ مذہبی عمل جیسے رمضان اگر اس وقت جون میں ہو تو چھ سال بعد وہ اپریل میں آئے گا (۱۹۳۵ء) میں ہجرت کو ۱۳۱۳ سال گزر چکے ہیں، جب سے کہ ہجری سال شروع ہوا، مگر ہماری ہر ایک صدی مسلمانوں کے قمری سال کے اعتبار سے ایک سو تین سال سے زیادہ کی ہوتی ہے، ہمارے عام شمسی سالوں کے اعتبار سے جب ۱۳۱۳ سال ہوتے ہیں تو مسلم سال کے اعتبار سے تقریباً اکتالیس سال زیادہ ہو چکے ہوتے ہیں، اس طرح مسلمانوں کا سال ہجری وقت تحریر ۱۳۵۴ تک پہنچ چکا ہے، یعنی شمسی اعتبار سے ۱۳۱۳ سالوں میں ۴۱ سال مزید، مشرقی ملکوں کے یہودی چرچ نے اس قسم کی لغویت (Absurdity) کو ختم کر کے لوند یا مہینوں کے اضافہ کا طریقہ (Intercalation) کو اختیار کیا اور اس طرح اپنے قمری کیلنڈر کو شمسی سال کے ڈھانچے کے مطابق بنا لیا، اس بنا پر تمام مغربی ایشیا اب تک اس انتہائی قدیم طریقے—

قمری کیلنڈر کی زحمت کو برداشت کر رہا ہے۔"

Time and its Mysteries, New York. 1962, p. 56

یہاں مجھے شمسی اور قمری کیلنڈر کے فرق پر کوئی بحث نہیں کرنی ہے، میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مصنف نے جس واقعہ کو پیغمبر اسلام کی طرف منسوب کر کے "انتہائی لغو بے خبری" کا الزام لگایا ہے، وہ واقعہ بذاتِ خود صحیح نہیں، قرآن میں جس چیز کی ممانعت کی گئی ہے، وہ کبیسہ کے مہینے ٹھہرانا نہیں بلکہ "نسئ" ہے، (توبہ۔۳۷) نسئ کے معنی عربی زبان میں تاخیر کے ہیں، یعنی موخر کرنا، ہٹانا، مثلاً حوض پر ایک جانور پانی پی رہا ہے، اور آپ نے اس کو ہٹا کر اپنے جانور کو حوض پر کھڑا کر دیا کہ پہلے آپ کا جانور پانی پی لے، اس کے بعد دوسرا پئے، تو اس طرح ہٹانے کو کہیں گے، "نَسَأَ الدَّابَّۃَ"

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعے عرب میں جو طریقے رائج ہوئے تھے، ان میں سے ایک یہ تھا کہ سال کے بارہ مہینوں میں سے چار مہینے "اشہر حرم" (خاص ادب واحترام کے مہینے) ہیں، یہ مہینے ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب تھے، ان میں خونریزی اور جدال وقتال قطعاً بند کر دیا جاتا تھا، لوگ حج وعمرہ اور کاروبار کے لئے امن وامان کے ساتھ آزادانہ سفر کر سکتے تھے، بعد کو جب قبائل عرب میں سرکشی پیدا ہوئی تو انھوں نے اس قانون کی پابندی سے بچنے کے لئے نسئ کی رسم نکالی، یعنی جب کسی زور آور قبیلہ کی خواہش ماہ محرم میں جنگ کرنے کی ہوئی تو ایک سردار نے اعلان کر دیا کہ امسال ہم نے محرم کو اشہر حرم سے نکال کر اس کی جگہ صفر کو حرام کر دیا، دوسرے لفظوں میں محرم کو اپنی جگہ سے ہٹا کر صفر کی جگہ رکھ دیا، یہی محترم مہینوں کو آگے پیچھے کرنے کی رسم تھی جس کو نسئ کہا جاتا تھا، اور اسی کے متعلق قرآن میں کہا گیا ہے کہ یہ "زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ" ہے۔

بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ عربوں میں "لوند" کی بھی ایک قسم کا رواج تھا، یعنی مہینوں کا عدد بدل دیتے تھے، مثلاً بارہ مہینے کے چودہ مہینے بنا لئے، مگر ایک مفسر قرآن کے الفاظ ہیں:۔

"بعض اقوام جو اپنے مہینوں کا حساب درست رکھنے کے لئے لوند کا مہینہ ہر تیسرے سال

بڑھاتی ہیں، وہ نسٹی میں داخل نہیں۔[1]

معلوم ہوا کہ دورِ بے خبری میں بھی پیغمبرِ خدا نے بے خبری کی بات نہیں کہی، حالانکہ اگر ان کے الفاظ محض شعور یا لاشعور سے نکلے ہوئے ہوتے تو اس قسم کی بے خبری کا ظاہر ہونا لازمی تھا۔ (اگلے ابواب میں تفصیلی مثالیں آرہی ہیں۔)

۳۔ تاریخ یا سماجی مطالعہ کے حوالے سے استدلال کرنے والوں کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ صحیح رخ سے مذہب کا مطالعہ نہیں کرتے، اس لئے پورا مذہب ان کو اصل حقیقت کے خلاف ایک اور ہی شکل میں نظر آنے لگتا ہے، ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چوکور چیز کو کوئی شخص ترچھا کھڑا ہو کر دیکھے، ظاہر ہے کہ ایسے شخص کو وہی چیز جو حقیقۃً چوکور ہے، تکونی نظر آسکتی ہے۔

ان حضرات کی غلطی یہ ہے کہ وہ مذہب کا مطالعہ ایک معروضی مسئلہ (Objective Problem) کے طور پر کرتے ہیں، یعنی ظاہری طور پر مذہب کے نام سے جو کچھ تاریخ میں کبھی پایا گیا ہے ان سب کو مذہب کے اجزا سمجھ کر یکساں حیثیت سے جمع کر لینا اور پھر ان کی روشنی میں مذہب کے بارے میں ایک رائے قائم کرنا، اس کی وجہ سے پہلے ہی قدم پر ان کی پوزیشن غلط ہو جاتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مذہب ان کی نظروں میں محض ایک سماجی عمل بن جاتا ہے نہ کہ کوئی انکشافِ حقیقت، ایک چیز جو انکشافِ حقیقت کی نوعیت رکھتی ہو، وہ بذاتِ خود ایک آئیڈیل ہوتی ہے، اور اس کے اپنے آئیڈیل کی روشنی میں اس کے مظاہر اور اس کی تاریخ کا مطالعہ کیا جاتا ہے، اس کے برعکس جو چیز سماجی عمل کی حیثیت رکھتی ہو، اس کا اپنا کوئی آئیڈیل نہیں ہوتا بلکہ سماج کا عمل ہی اس کی حقیقت کا تعین کرتا ہے، کوئی چیز جو سماجی آداب یا سماجی روایات کی حیثیت رکھتی ہو اس کی یہ حیثیت صرف اس وقت تک قائم رہتی ہے، جب تک سماج نے بالفعل اس کو یہ حیثیت دے رکھی ہو، اگر سماج اس کو چھوڑ کر اس کی جگہ کوئی اور طریقہ اختیار کرلے تو پھر وہ ایک تاریخی چیز ہو جاتی ہے اور سماجی

---

[1] J. Huxly, *Man in the Modern World*, p.129

روایت کی حیثیت سے اس کا کوئی مقام باقی نہیں رہتا۔

مگر مذہب کا معاملہ اس سے مختلف ہے، مذہب کا مطالعہ ہم اس طرح نہیں کر سکتے، جس طرح ہم سواری اور لباس اور مکان کا مطالعہ کرتے ہیں، کیوں کہ مذہب اپنی ذات میں ایک حقیقت ہے، جس کو سماج اپنے ارادہ سے قبول کرتا ہے یا اسے قبول نہیں کرتا یا قبول کرتا ہے تو ناقص شکل میں، اس کی وجہ سے مذہب اپنی اصولی حیثیت میں تو ہمیشہ یکساں رہتا ہے، مگر سماج کے اندر رواج یافتہ ہیئت کے اعتبار سے اس کی شکلیں مختلف ہو جاتی ہیں' اس لئے سماج کے اندر رواج یافتہ مذاہب کی یکساں فہرست بندی کر کے ہم مذہب کو سمجھ نہیں سکتے۔

مثال کے طور پر جمہوریت کو لیجئے' جمہوریت ایک مخصوص سیاسی معیار کا نام ہے' اور کسی حکومت کو اس معیار کی روشنی ہی میں جمہوری یا غیر جمہوری کہا جا سکتا ہے' یعنی جمہوریت کے اپنے معیار کی رو سے تمام ملکوں کو دیکھا جائے گا' اور صرف اسی رویہ کو جمہوری قرار دیا جائے گا جو حقیقۃً" جمہوری ہو' اس کے برعکس اگر جمہوریت کا مطالعہ اس طرح کیا جائے کہ ہر وہ ملک جس نے اپنے نام کے ساتھ "جمہوری" کا لفظ لگا رکھا ہے' اس کو حقیقۃً" جمہوری فرض کر کے جمہوریت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو پھر جمہوریت ایک بے معنی لفظ بن جائے گا، کیونکہ ایسی حالت میں امریکہ کی جمہوریت چین کی جمہوریت سے مختلف ہو گی، انگلینڈ کی جمہوریت مصر کی جمہوریت سے ٹکرائے گی، ہندوستان کی جمہوریت کا پاکستان کی جمہوریت سے کوئی جوڑ نہیں ہو گا، اس کے بعد جب ان سارے مشاہدات کو ارتقائی ڈھانچہ میں رکھ کر دیکھا جائے گا تو وہ اور زیادہ بے معنی ہو جائے گا، کیوں کہ فرانس جو جمہوریت کا مقام پیدائش ہے' اس کا مطالعہ بتائے گا کہ جمہوریت اپنے بعد کے ارتقائی مرحلہ کے مطابق نام ہے' جنرل ڈیگال (۱۸۹۰—۱۹۷۰) کی فوجی آمریت کا۔

اس طریق مطالعہ کا یہ نتیجہ ہے کہ مذہب کے لئے خدا کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی' مذہب کی "تاریخ" میں اس کی مثال موجود ہے کہ مذہب خدا کے بغیر بھی ہو سکتا ہے' یہ مثال بدھ دھرم کی ہے' جو "مذہب" ہونے کے باوجود خدا کے تصور سے خالی ہے، اس لئے آج بہت سے لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ مذہب کا مطالعہ خدا

ے الگ کر کے کیا جانا چاہئے، اگر اس ضرورت کو تسلیم کر لیا جائے کہ لوگوں کے اندر اخلاق اور سطیم پیدا کرنے کے لئے مذہبی نوعیت کی کوئی چیز ضروری ہے تو اس مقصد کے لئے لازمی طور پر خدا کو ماننا ضروری نہیں، بے خدا مذہب بھی اس ضرورت کو پورا کر سکتا ہے، چنانچہ یہ لوگ بدھزم کے حوالے سے یہ کہتے ہیں کہ اب موجودہ ترقی یافتہ دور میں اس قسم کا مذہبی ڈھانچہ سماج کے لئے زیادہ موزوں ہے، ان حضرات کے نزدیک دورِ جدید کا خدا خود سماج اور اس کے سیاسی اور معاشی مقاصد ہیں، اس خدا کا پیغمبر پارلیمنٹ ہے، جس کے ذریعہ وہ اپنی مرضی سے انسانوں کو باخبر کرتا ہے، اور اس کی عبادت گاہیں، مسجد اور گرجا نہیں بلکہ ڈیم اور کارخانے ہیں، وغیرہ وغیرہ (ملاحظہ ہو جولین ہکسلے کی کتاب "مذہب بغیر الہام")۔

مذہب کو اقرارِ خدا سے انکارِ خدا تک پہنچانے میں نام نہاد ارتقائی مطالعہ کا بھی دخل ہے، یہ حضرات یہ کرتے ہیں کہ پہلے ان تمام چیزوں کو جمع کر لیتے ہیں جو کبھی مذہب کے نام سے منسوب رہی ہیں، اور اس کے بعد اپنی مرضی کے مطابق ان کے درمیان ایک ارتقائی ترتیب قائم کر لیتے ہیں، جس میں ایسے تمام پہلوؤں کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے جس سے ان کی مزعومہ ارتقائی ترتیب مشتبہ ہو سکتی ہو، مثلاً انسانیات (Ontology) اور سماجیات (Sociology) کے ماہرین نے زبردست مطالعہ اور تحقیق کے بعد یہ "دریافت" کیا ہے کہ خدا کا تصور کئی خداؤں سے شروع ہوا اور بتدریج ترقی کرتے کرتے ایک خدا تک پہونچا، لیکن یہ ترقی ان کے نزدیک الٹی ہوئی ہے، کیونکہ خدا کے تصور نے ایک خدا کی شکل اختیار کر کے اپنے آپ کو تضاد میں مبتلا کر لیا ہے، "کئی خدا" کا تصور کم از کم اپنے اندر یہ قدر رکھتا تھا کہ مختلف خداؤں کو ماننے والے ایک دوسرے کو تسلیم کرتے ہوئے باہم مل جل کر رہیں، مگر "ایک خدا" کے عقیدے نے قدرتی طور پر تمام دوسرے خداؤں اور ان کو ماننے والوں کو باطل ٹھہرایا اور برتر مذہب Higher Religion کا تصور پیدا کیا جس کی وجہ سے قوموں اور گروہوں میں کبھی نہ ختم ہونے والی جنگیں شروع ہو گئیں، اس طرح خدا کے تصور نے غلط سمت میں ارتقا کر کے خود ہی اپنے لئے موت کا سامان مہیا کر دیا ہے، کیوں کہ ارتقا کا

قانون یہی ہے۔ Man in the Modern World, p.112

مگر اس ارتقائی ترتیب میں صریح طور پر اصل واقعہ کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، کیوں کہ معلوم تاریخ کے مطابق سب سے پہلے پیغمبر حضرت نوحؑ تھے، اور ان کی دعوت کے متعلق ثابت ہے کہ وہ ایک خدا کی دعوت تھی، اس کے علاوہ تعدد آلہہ (Polytheism) کا مطلب بھی مطلق تعدد نہیں ہے، کبھی کوئی قوم ان معنوں میں مشرک نہیں رہی ہے کہ وہ بالکل یکساں نوعیت کے کئی خدا مانتی ہو، اس کے برعکس تعدد آلہہ کا مطلب ایک بڑے خدا کو مان کر کچھ اس کے مقربین خاص کا اقرار کرنا ہے، جو ذیلی خداؤں کے طور پر کام کرتے ہیں، شرک کے ساتھ ہمیشہ ایک "خدائے خدائگان" کا تصور پایا جاتا رہا ہے، ایسی حالت میں "ارتقائی مذہب" ایک بے دلیل عقیدہ کے سوا اور کیا ہے ———

مارکسی نظریۂ تاریخ اور زیادہ لغو ہے، یہ نظریہ اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ اقتصادی حالات ہی وہ اصل عامل ہیں، جو انسان کی تعمیر و تشکیل کرتے ہیں، مذہب جس زمانے میں پیدا ہوا وہ جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کا زمانہ تھا، اب چونکہ جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام استحصال اور لوٹ کھسوٹ کا نظام ہے، اس لئے اس کے درمیان پیدا ہونے والے اخلاقی و مذہبی تصورات بھی یقینی طور پر اپنے ماحول ہی کا عکس ہوں گے وہ لوٹ کھسوٹ کے نظریات ہوں گے مگر یہ نظریہ علمی حیثیت سے کوئی وزن رکھتا ہے اور نہ تجربہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

یہ نظریہ انسانی ارادہ کی بالکلیہ نفی کر دیتا ہے، اور اس کو صرف معاشی حالات کی پیداوار قرار دیتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی اپنی کوئی ہستی نہیں جس طرح صابن کے کارخانے میں صابن ڈھلتے ہیں، اسی طرح آدمی بھی اپنے ماحول کے کارخانے میں ڈھلتا ہے، وہ الگ سے سوچ کر کوئی کام نہیں کرتا بلکہ جو کچھ کرتا ہے، اسی کے مطابق سوچنے لگتا ہے، اگر یہ واقعہ ہے تو مارکس، جو خود بھی "سرمایہ دارانہ نظام" کے اندر پیدا ہوا تھا، اس کے لئے کس طرح ممکن ہوا کہ وہ اپنے وقت کے معاشی حالات کے خلاف سوچ سکے، کیا اس نے زمین کا مطالعہ چاند پر جا کر کیا تھا، اگر مذہب کو پیدا کرنے والی چیز وقت کا اقتصادی نظام ہے تو آخر مارکسزم بھی وقت کے اقتصادی

نظام کی پیداوار کیوں نہیں ہے، مذہب کی جو حیثیت مارکسزم کو تسلیم نہیں ہے، وہی حیثیت اس کے اپنے لئے کس طرح جائز ہوگی ——— حقیقت یہ ہے کہ یہ نظریہ اشتعال انگیز حد تک لغو ہے، اس کے پیچھے کوئی بھی علمی اور عقلی دلیل موجود نہیں۔

تجربے سے بھی اس نظریئے کی غلطی واضح ہو چکی ہے، روس کی مثال اس کو سمجھنے کے لئے کافی ہے، جہاں تقریباً آدھی صدی سے اس نظریہ کو مکمل غلبہ حاصل ہے، طویل ترین مدت سے زبردست پروپیگنڈہ ہو رہا ہے، کہ روس کے مادی حالات بدل گئے ہیں، وہاں کا نظام پیداوار، نظام تبادلہ اور نظام تقسیم دولت سب غیر سرمایہ دارانہ ہو چکا ہے، مگر اسٹالن کے مرنے کے بعد خود روسی لیڈروں کی طرف سے تسلیم کیا گیا ہے کہ اسٹالن کے زمانۂ حکومت میں روس کے اندر ظلم و جبر کا نظام رائج تھا، اور عوام کا اسی طرح استحصال کیا جا رہا تھا، جیسے سرمایہ دارانہ ملکوں میں ہوتا ہے، اور اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ روس میں پریس پر حکومت کا مکمل کنٹرول ہونے کی وجہ سے اسٹالن کے لئے یہ ممکن ہو سکا کہ وہ اپنے ظلم اور استحصال کو دنیا کے سامنے عدل و انصاف کے نام سے مشہور کرے، اور پریس کا یہی کنٹرول اب بھی وہاں جاری ہے، تو یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ آج بھی خوبصورت پروپیگنڈے کے پس منظر میں روس کے اندر وہی سب کچھ ہو رہا ہے، جو اسٹالن کے زمانے میں ہوتا تھا، روسی کمیونسٹ پارٹی کی بیسویں کانگرس (فروری ۱۹۵۶ء) نے اسٹالن کے مظالم کا انکشاف کیا تھا، اس کے بعد اگر پارٹی کی کوئی اور کانگرس خروشچیف کی درندگی کا راز فاش کرے تو اس میں ہرگز اچنبھے کی کوئی بات نہ ہوگی[1] ——— آدھی صدی کے اس تجربے سے جو نتیجہ نکلا ہے، اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ پیداوار اور تبادلہ کی نام نہاد تبدیلی سے انسان نہیں بدل جاتے، اگر انسانی ذہن نظام پیداوار کا تابع ہوتا اور اسی کے مطابق خیالات پیدا ہوا کرتے تو اشتراکی حکومت میں ظلم اور استحصال کی ذہنیت بھی یقینی طور پر پیدا نہیں ہونی چاہئے تھی۔

---

[1] اکتوبر ۱۹۶۴ء میں خروشچیف کی برطرفی اور اس کے بعد کے واقعات سے اس کی تصدیق ہو چکی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب کے خلاف دورِ جدید کا پورا استدلال ایک قسم کا علمی سفسطہ (Scientific Sophism) ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں، اس نام نہاد علمی استدلال کی حقیقت صرف یہ ہے کہ "کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا" یہ صحیح ہے کہ واقعات کے مطالعہ کے لئے "علمی طریقہ" اختیار کیا جاتا ہے، مگر علمی طریقہ محض ایک طریقہ ہونے کی وجہ سے صحیح نتائج تک نہیں پہونچا سکتا، اسی کے ساتھ دوسرے ضروری پہلوؤں کو ملحوظ رکھنا ناگزیر ہے، مثلاً ادھوری اور یک رخی معلومات پر اگر علمی طریقہ کو آزمایا جائے تو وہ بظاہر علمی ہونے کے باوجود ناقص اور غلط نتیجے ہی تک پہنچائے گا۔

جنوری ۱۹۶۴ء کے پہلے ہفتہ میں نئی دہلی میں مستشرقین کی ایک بین الاقوامی کانگرس ہوئی جس میں بارہ سو علمائے مشرقیات شریک ہوئے، اس موقع پر ایک صاحب نے ایک مقالہ پڑھا جس میں کئی مسلم یادگاروں کے بارے میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کی بنوائی ہوئی نہیں ہیں بلکہ ہندو راجاؤں کی بنوائی ہوئی ہیں، مثلاً قطب مینار جو قطب الدین ایبک کی طرف منسوب ہے، وہ دراصل وشنو دھوج ہے، جس کو اب سے ۲۳ سو سال پہلے سمندر گپت نے بنوایا تھا، بعد کے مسلم مورخین نے اس کو غلط طور پر قطب مینار کے نام سے پیش کیا، اس کی دلیل یہ ہے کہ قطب مینار میں ایسے پتھر لگے ہوئے ہیں جو بہت پرانے ہیں، اور قطب الدین ایبک سے بہت پہلے تراشے گئے تھے۔

بظاہر یہ ایک علمی استدلال ہے، کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ قطب مینار میں ایسے کچھ پتھر موجود ہیں، مگر قطب مینار کے مطالعہ کے لئے صرف اس کے پرانے پتھروں کا حوالہ دینے سے علمی استدلال کا حق ادا نہیں ہوتا، اسی کے ساتھ اور بہت سے پہلوؤں کو سامنے رکھنا ضروری ہے، اور جب ہم ایسا کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ توجیہ قطب مینار پر پوری طرح چسپاں نہیں ہوتی، اس کے بجائے یہ دوسری توجیہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ اس کے پرانے پتھر دراصل پرانی عمارتوں کے کھنڈر سے حاصل کئے گئے جس طرح دوسری قدیم سنگی عمارتوں میں کثرت سے اس کی مثالیں موجود ہیں، پھر جب اس دوسری توجیہ کو قطب مینار کی ساخت، اس کے نقشۂ تعمیر، پرانے پتھروں کا اندازِ نصب، مینار کے ساتھ نا تمام مسجد اور جوابی مینار کے بقیہ آثار نیز تاریخی شہادتوں کے ساتھ ملا کر دیکھیں تو

ثابت ہو جاتا ہے کہ یہی دوسری توجیہ صحیح ہے اور پہلی توجیہ ایک مغالطہ کے سوا اور کچھ نہیں۔

مخالفین مذہب کا مقدمہ بھی بالکل ایسا ہی ہے، جس طرح مذکورہ بالا مثال میں چند پتھروں کو ایک خاص رنگ دے کر سمجھ لیا گیا ہے کہ علمی استدلال حاصل ہو گیا، اسی طرح چند جزئی اور اکثر اوقات غیر متعلق واقعات کو ناقص رخ سے پیش کر کے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ علمی طریق مطالعہ نے مذہب کی تردید کر دی، حالانکہ واقعہ کے تمام اجزاء کو صحیح رخ سے دیکھا جائے تو بالکل دوسرا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب کی صداقت کا یہ بذاتِ خود ایک کافی ثبوت ہے کہ اس کو چھوڑنے کے بعد بہترین ذہن بھی الل ٹپ باتیں کرنے لگتے ہیں، اس کے بعد آدمی کے پاس مسائل پر غور و فکر کے لئے کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی، مخالفینِ مذہب کی فہرست میں جو نام ہیں، وہ اکثر نہایت ذہین اور ذی علم افراد ہیں، بہترین دماغ، وقت کے بہترین علوم سے آراستہ ہو کر اس میدان میں اترے ہیں، مگر ان اہل دماغ نے ایسی ایسی مہمل باتیں لکھی ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو لکھتے وقت آخر ان کا دماغ کہاں چلا گیا تھا، یہ سارا لٹریچر بے یقینی، تضاد، اعتراف ناواقفیت اور الل ٹپ استدلال سے بھرا ہوا ہے، کھلی ہوئی حقیقتوں کو نظر انداز کرنا اور معمولی تنکے کے سہارے دعاوی کے پل کھڑے کرنا، یہ ان کا کل کارنامہ ہے، یہ صورتِ حال بلاشبہ اس بات کا ایک قطعی ثبوت ہے کہ ان حضرات کا مقدمہ صحیح نہیں، کیونکہ بیان اور استدلال کی یہ خرابیاں صرف غلط مقدمہ کی خصوصیت ہیں، صحیح مقدمے میں کبھی یہ چیزیں پائی نہیں جا سکتی۔

مذہب کی صداقت اور مخالفین مذہب کے نظریے کی غلطی اس سے بھی واضح ہے کہ مذہب کو مان کر زندگی اور کائنات کا جو نقشہ بنتا ہے، وہ ایک نہایت حسین و جمیل نقشہ ہے، وہ انسان کے اعلیٰ افکار سے اسی طرح مطابق ہے جیسے مادی کائنات ریاضیاتی معیاروں کے عین مطابق ہے، اس کے برعکس مخالفِ مذہب فلسفہ کے تحت جو نقشہ بنتا ہے، وہ انسانی ذہن سے بالکل غیر متعلق ہے، یہاں میں برٹرینڈ رسل کا ایک اقتباس نقل کروں گا۔

"انسان ایسے اسباب کی پیداوار ہے، جن کا پہلے سے سوچا سمجھا کوئی مقصد نہیں، اس کا آغاز، اس کی نشو و نما، اس کی تمنائیں اور اس کے اندیشے، اس کی محبت اور اس کے عقائد، سب محض ایٹموں کی اتفاقی ترتیب کا نتیجہ ہیں، اس کی زندگی کی انتہا قبر ہے اور اس کے بعد کوئی چیز بھی اسے زندگی عطا نہیں کر سکتی، قرنہا قرن کی جدوجہد، تمام قربانیاں، بہترین احساسات اور عبقریت کے روشن کارنامے سب نظام شمسی کے خاتمہ کے ساتھ فنا ہو جانے والی چیزیں ہیں، انسانی کامرانیوں کا پورا محل ناگزیر طور پر کائنات کے ملبے کے نیچے دب کر رہ جائے گا، یہ باتیں اگر بالکل قطعی نہیں تو وہ حقیقت سے اتنی قریب (So Nearly Certain) ہیں کہ جو فلسفہ بھی اس کا انکار کرے گا وہ باقی نہیں رہ سکتا ہے"[1]

یہ اقتباس گویا غیر مذہبی مادی فکر کا خلاصہ ہے، اس کے مطابق ساری زندگی نہ صرف یہ کہ بالکل تیرہ و تار نظر آتی ہے، بلکہ اگر زندگی کی مادی تعبیر کو لیا جائے تو پھر خیر و شر کا کوئی قطعی معیار باقی نہیں رہتا، اس کی رو سے انسانوں پر بم گرانا کوئی ظالمانہ فعل نہیں کیونکہ انسانوں کو بہرحال ایک دن مرنا ہے، اس کے برعکس مذہبی فکر میں امید کی روشنی ہے، اس میں زندگی اور موت دونوں بامعنی نظر آنے لگتے ہیں، اس میں ہماری نفسیات کے تمام تقاضے اپنی جگہ پا لیتے ہیں، ایک تصور کے ریاضیاتی ڈھانچے میں فٹ ہو جانے کے بعد اگر سائنسداں مطمئن ہو جاتا ہے، کہ اس نے حقیقت پالی تو مذہبی تصور کا انسانی ذہن میں پوری طرح بیٹھ جانا یقینی طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ یہی وہ حقیقت ہے، جس کو انسان کی فطرت تلاش کر رہی تھی، اس کے بعد ہمارے پاس اس کے انکار کے لئے کوئی واقعی بنیاد باقی نہیں رہتی۔

یہاں میں ایک امریکی ریاضی داں (Earl Chester Rex) کے الفاظ نقل کروں گا۔

"میں سائنس کے اس تسلیم شدہ اصول کو استعمال کرتا ہوں جو دو یا زیادہ مختلف نظریوں میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے کے لئے کام میں لایا جاتا ہے، اس اصول کے مطابق اس نظریے کو اختیار کر لیا جاتا ہے، جو مقابلۃً نہایت سادگی کے ساتھ تمام متنازعہ فیہ مسائل کی تشریح کرے، بہت عرصہ

---

[1] Limitations of Science, p.133

ہوا جب یہی اصول ٹولوی کے نظریے (Ptolemaic Theory) اور کوپرنکس کے نظریے کے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے استعمال کیا گیا۔ اول الذکر کا دعویٰ تھا کہ زمین نظام شمسی کا مرکز ہے، اس کے برعکس ثانی الذکر کہتا تھا کہ سورج نظام شمسی کا مرکز ہے، ٹولوی کا نظریہ اس قدر پیچیدہ اور الجھا ہوا تھا کہ زمین کی مرکزیت کا نظریہ رد کر دیا گیا۔"[1]

مجھے اعتراف ہے کہ میرا یہ استدلال بہت سے لوگوں کے لئے کافی نہیں ہوگا، ان کے مادی ذہن کے چوکھٹے میں کسی طرح خدا اور مذہب کی بات نہیں بیٹھے گی، مگر جو چیز مجھے مطمئن کرتی ہے، وہ یہ کہ ان حضرات کا یہ عدم اطمینان حقیقۃً مذہب کے حق میں استدلال کی کمی کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ اس کی وجہ ان کا وہ متعصبانہ ذہن ہے جو مذہبی استدلال کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا، جیمز جینز نے اپنی کتاب "پراسرار کائنات" کے آخر میں نہایت صحیح لکھا ہے کہ:۔

"ہمارے جدید ذہن واقعات کی مادی توجیہہ کے حق میں ایک طرح کا تعصب Bias رکھتے ہیں۔"[2]

وھٹکر چیمبرز (Whittaker Chambers) نے اپنی کتاب شہادت (Witness) میں اپنے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے، جو بلاشبہ اس کی زندگی کے لئے ایک نقطۂ انقلاب Turning Point بن سکتا تھا، وہ اپنی چھوٹی بچی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر بچی کے کان پر جا پڑی اور غیر شعوری طور پر وہ اس کی ساخت کی طرف متوجہ ہو گیا، اس نے اپنے جی میں سوچا "یہ کتنی غیر ممکن بات ہے کہ ایسی پیچیدہ اور نازک چیز محض اتفاق سے وجود میں آجائے، یقیناً یہ پہلے سے سوچے سمجھے نقشے کے تحت ہی ممکن ہوئی ہوگی" مگر اس نے جلد ہی اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال دیا، کیونکہ اسے احساس ہوا کہ اگر وہ اس کو ایک منصوبہ مان لے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ اسے منصوبہ ساز (خدا) کو بھی ماننا ہوگا، اور یہ ایک ایسا تصور تھا، جسے قبول کرنے کے لئے اس کا ذہن آمادہ نہیں تھا۔

---

[1] *The Evidence of God*, p.179 [2] *Mysterious Universe*, p.189

اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ٹامس ڈیوڈ پارکس (Thomas David Parks) لکھتا ہے۔

"میں اپنے پروفیسروں اور ریسرچ کے سلسلے میں اپنے رفقاء کار میں بہت سے سائنسدانوں کے بارے میں جانتا ہوں کہ علم کیمیا اور طبیعیات کے مطالعہ و تجربہ کے دوران میں انھیں بھی متعدد مرتبہ اس طرح کے احساسات سے دوچار ہونا پڑا۔"

The Evidence of God in an Expanding Universe.
Edited by John Clover Monsma,
New York, 1958, p.73-74

نظریۂ ارتقاء کی صداقت پر موجودہ زمانے کے "سائنسداں" متفق ہو چکے ہیں، ارتقاء کا تصور ایک طرف تمام علمی شعبوں پر چھاتا جا رہا ہے، ہر وہ مسئلہ جس کو سمجھنے کے لئے خدا کی ضرورت تھی، اس کی جگہ بے تکلف ارتقاء کا ایک خوبصورت بت بنا کر رکھ دیا گیا ہے، مگر دوسری طرف عضویاتی ارتقاء (Organic Evolution) کا نظریہ، جس سے تمام ارتقائی تصورات اخذ کئے گئے ہیں، اب تک بے دلیل ہے، حتیٰ کہ بعض علماء نے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ اس تصور کو ہم صرف اس لئے مانتے ہیں کہ اس کا کوئی بدل ہمارے پاس موجود نہیں ہے، سر آرتھر کیتھ (Keith) نے ۱۹۵۳ء میں کہا تھا۔

"Evolution is unproved and unprovable. We believe it only because the only alternative is special creation and that is unthinkable."

Islamic Thought, Dec. 1961

یعنی ارتقاء ایک غیر ثابت شدہ نظریہ ہے اور وہ ثابت بھی نہیں کیا جا سکتا، ہم اس پر صرف اس لئے یقین کرتے ہیں کہ اس کا واحد بدل تخلیق کا عقیدہ ہے جو سائنسی طور پر ناقابلِ فہم ہے، گویا سائنسداں ارتقاء کے نظریے کی صداقت پر صرف اس لئے متفق ہو گئے ہیں کہ اگر وہ اسے چھوڑ دیں تو لازمی طور پر انھیں خدا کے تصور پر ایمان لانا پڑے گا۔

ظاہر ہے کہ جو لوگ مادی طرز تعبیر کے حق میں اس قسم کے تعصبات رکھتے ہوں، وہ انتہائی کھلے ہوئے واقعات سے بھی کوئی سبق نہیں لے سکتے تھے، اور مجھے اعتراف ہے کہ ایسے لوگوں کو مطمئن کرنا میرے بس سے باہر ہے اس تعصب کی بھی ایک خاص وجہ ہے، یہاں میں ایک امریکی عالم طبیعیات (George Herbert Blount) کے الفاظ نقل کروں گا۔

"خدا پرستی کی معقولیت اور انکار خدا کا پھسپھسا پن بجائے خود ایک آدمی کے لئے عملاً خدا پرستی اختیار کرنے کا سبب نہیں بن سکتا، لوگوں کے دل میں یہ شبہ چھپا ہوا ہے کہ خدا کو ماننے کے بعد آزادی کا خاتمہ ہو جائے گا، وہ علما جو ذہنی آزادی (Intellectual Liberty) کو دل و جان سے پسند کرتے ہیں، آزادی کی محدودیت کا کوئی بھی تصور ان کے لئے وحشتناک ہے"

The Evidence of God, p. 130

چنانچہ جولین ہکسلے نے نبوت کے تصور کو "ناقابل برداشت اظہار برتری" قرار دیا ہے، کیونکہ کسی کو نبی ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو یہ حیثیت دی جائے کہ اس کی بات خدا کی بات ہے، اور اس کو حق ہے کہ وہ جو کچھ کہے تمام لوگ اس کو قبول کر لیں، لیکن جب انسان کی حیثیت یہی ہے کہ وہ خالق نہیں مخلوق ہے، وہ خدا نہیں بلکہ خدا کا بندہ ہے، تو اس صورت واقعہ کو کسی خود ساختہ تصور کی بنا پر ختم نہیں کیا جا سکتا، ہم حقیقت کو بدل نہیں سکتے، ہم صرف اس کا اعتراف کر سکتے ہیں، اب اگر شتر مرغ کا انجام ہم اپنے لئے پسند نہیں کرتے تو ہماری بہترین عقلمندی یہ ہے کہ جو کچھ ہے اسے مان لیں، نہ یہ کہ جو کچھ ہے اس کا انکار کر دیں، حقیقت کا انکار کر کے آدمی صرف اپنا نقصان کرتا ہے، وہ حقیقت کا کچھ نہیں بگاڑتا۔

استدلال کا طریقہ

مذہب کے خلاف دورِ جدید کا جو مقدمہ ہے، وہ اصلاً طریقِ استدلال کا مقدمہ ہے، یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ علم کی ترقی نے حقیقت کے مطالعہ کا جو اعلیٰ اور ارتقا یافتہ طریقہ معلوم کیا ہے، مذہب کے دعوے اور عقیدے اس پر پورے نہیں اترتے، یہ جدید طریقہ، مشاہدہ اور تجربہ کے ذریعہ حقائق کو معلوم کرنے کا طریقہ ہے اب چونکہ مذہب کے عقائد ماورائے احساس دنیا سے متعلق ہونے کی وجہ سے تجربہ اور مشاہدہ میں نہیں آسکتے، ان کا استدلال تمام تر قیاس اور استقراء پر مبنی ہے اس لئے وہ غیر حقیقی ہیں[1]، ان کی کوئی علمی بنیاد نہیں۔

مگر یہ مقدمہ بجائے خود صحیح نہیں، جدید طریقہ مطالعہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صرف وہی چیز اپنا حقیقی وجود رکھتی ہے، جو براہِ راست ہمارے تجربے میں آئی ہو، بلکہ براہِ راست تجربے میں آنے والی چیزوں کی بنیاد پر جو علمی قیاس کیا جاتا ہے، وہ بھی اسی طرح حقیقت ہو سکتا ہے، جیسے کوئی تجربہ۔ نہ تجربہ محض تجربہ ہونے کی بنا پر صحیح ہے، اور نہ قیاس محض قیاس ہونے کی بنا پر غلط، ہر ایک میں صحت اور غلطی دونوں کا امکان ہے۔

پہلے زمانے میں سمندری جہاز لکڑی کے بنائے جاتے تھے، کیونکہ تصور یہ تھا کہ پانی پر وہی چیز تیر سکتی ہے،

---

[1] مثلاً خدا کے اثبات کے لئے ہم یہ نہیں کرتے کہ خود خدا کو کسی دوربین کے ذریعہ سے دکھا دیں، بلکہ یوں استدلال کرتے ہیں کہ کائنات کا نظم اور اس کی معنویت اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے پیچھے کوئی خدائی ذہن موجود ہے، اس طرح ہماری دلیل براہِ راست خدا کو ثابت نہیں کرتی بلکہ ایک ایسے قرینہ کو ثابت کرتی ہے جس کے منطقی نتیجہ کے طور پر خدا کو ماننا پڑے۔

جو وزن میں پانی سے ہلکی ہو، جب یہ دعویٰ کیا گیا کہ لوہے کے جہاز بھی پانی پر اسی طرح تیر سکتے ہیں، جس طرح لکڑی کے جہاز سطحِ بحر پر چلتے ہیں تو اس بنا پر اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا کہ لوہا وزنی ہونے کی وجہ سے پانی کی سطح پر تیر ہی نہیں سکتا، کسی لوہار نے اس دعویٰ کو غلط ثابت کرنے کے لئے پانی کے ٹب میں لوہے کا نعل ڈال کر دکھا دیا کہ وہ پانی کی سطح پر تیرنے کے بجائے ٹب کی تہ میں بیٹھ جاتا ہے، بظاہر یہ ایک تجربہ تھا، مگر یہ تجربہ صحیح نہیں تھا' کیونکہ اس نے اگر پانی میں لوہے کا تسلہ ڈالا ہوتا تو اسے معلوم ہوتا کہ دعویٰ کرنے والے کا دعویٰ صحیح ہے۔

اسی طرح ابتدا میں جب کم طاقت کی دوربینوں سے آسمان کا مشاہدہ کیا گیا تو بہت سے ایسے اجسام مشاہدے میں آئے جو پھیلے ہوئے نور کی مانند دکھائی دے رہے تھے، اس مشاہدے کی بنا پر یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ یہ گیسی بادل ہیں، جو ستارے بننے سے پہلے کے مرحلے سے گزر رہے ہیں، مگر جب مزید طاقت کی دوربینیں تیار ہوئیں اور ان کے ذریعہ از سرِ نو ان اجسام کو دیکھا گیا تو نظر آیا کہ جو چیز پہلے نورانی بادل کی شکل میں دکھائی دیتی تھی، وہ دراصل بے شمار ستاروں کا مجموعہ تھا، جو غیر معمولی دوری کی وجہ سے بادل کی مانند نظر آ رہا تھا۔

معلوم ہوا کہ مشاہدہ اور تجربہ نہ صرف یہ کہ بذاتِ خود علم کے قطعی ذرائع نہیں ہیں، بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ علم صرف ان چیزوں کا نام نہیں ہے جو براہِ راست ہمارے مشاہدہ و تجربہ میں آتی ہوں، دورِ جدید نے بے شک بہت سے آلات اور ذرائع دریافت کر لئے ہیں، جن سے وسیع پیمانے پر تجربہ و مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، مگر یہ آلات و ذرائع جن چیزوں کا ہمیں تجربہ کراتے ہیں، وہ صرف کچھ اوپری اور نسبتاً غیر اہم چیزیں ہوتی ہیں، اس کے بعد ان مشاہدات و تجربات کی بنیاد پر جو نظریات قائم کئے جاتے ہیں، وہ سب کے سب غیر مرئی ہوتے ہیں، نظریات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ساری سائنس کچھ مشاہدات کی توجیہہ کا نام ہے، یعنی خود نظریات وہ چیزیں نہیں ہیں، جو ہمارے مشاہدہ یا تجربے میں آئے ہوں، بلکہ کچھ تجربات و مشاہدات نے سائنس دانوں کو یہ ماننے پر مجبور کیا ہے کہ یہاں فلاں حقیقت موجود ہے، اگرچہ وہ خود مشاہدہ میں نہیں آئی، کوئی سائنس داں یا مادہ پرست فورس، انرجی، نیچر، قانونِ فطرت' وغیرہ الفاظ استعمال کئے بغیر ایک قدم آگے نہیں چل سکتا'

مگر کوئی بھی سائنس داں نہیں جانتا کہ قوت یا نیچر کیا ہے، سوا اس کے کہ معلوم واقعات و ظواہر کی نامعلوم اور ناقابل مشاہدہ علت کے لئے چند مختلف تعبیری الفاظ وضع کر لئے گئے ہیں، جن کی حقیقت معنوی کی تشریح سے ایک سائنس داں بھی اسی طرح عاجز ہے، جس طرح اہلِ مذاہب خدا کی تشریح و توصیف سے، دونوں اپنی جگہ ایک نامعلوم علت کائنات پر غیبی اعتقاد رکھتے ہیں، ڈاکٹر الکسس کیرل کے الفاظ میں۔

"ریاضیاتی کائنات قیاسات اور مفروضات کا ایک شاندار جال ہے، جس میں علامتوں کی مساوات (Equations of Symbols) پر مشتمل ناقابلِ بیان مجردات (Abstractions) کے سوا اور کچھ نہیں۔"

Man the Unknown, p.15

سائنس ہرگز یہ دعویٰ نہیں کرتی اور نہیں کر سکتی کہ حقیقت صرف اسی قدر ہے، جو حواس کے ذریعہ بلاواسطہ ہمارے تجربہ میں آئی ہو، یہ واقعہ کہ پانی ایک رقیق اور سیال چیز ہے، اس کو ہم براہ راست اپنی آنکھوں کے ذریعہ دیکھ لیتے ہیں، مگر یہ واقعہ کہ پانی کا ہر ایک کیول ہائیڈروجن کے دو ایٹم اور آکسیجن کے ایک ایٹم پر مشتمل ہے، یہ ہم کو آنکھ سے یا کسی خوردبین سے نظر نہیں آتا، بلکہ صرف منطقی استنباط کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے، اور سائنس ان دونوں واقعات کی موجودگی یکساں طور پر تسلیم کرتی ہے، اس کے نزدیک جس طرح وہ عام پانی ایک حقیقت ہے، جو مشاہدہ میں نظر آرہا ہے، اسی طرح وہ تجزیاتی پانی بھی ایک حقیقت ہے، جو قطعاً ناقابل مشاہدہ ہے، اور صرف قیاس کے ذریعہ معلوم کیا گیا ہے، یہی حال دوسرے تمام حقائق کا ہے، اے۔ ای مینڈر A.E. Mander لکھتا ہے:

"جو حقیقتیں ہم کو براہ راست حواس کے ذریعہ معلوم ہوں، وہ محسوس حقائق (Perceived Facts) ہیں، مگر جن حقیقتوں کو ہم جان سکتے ہیں، وہ صرف انھیں محسوس حقائق تک محدود نہیں ہیں، ان کے علاوہ اور بہت سی حقیقتیں ہیں جن کا علم اگرچہ براہ راست ہم حاصل نہیں کر سکتے، پھر بھی ہم ان کے بارے میں جان سکتے ہیں، اس علم کا ذریعہ استنباط ہے، اس طرح جو حقیقتیں معلوم ہوں، ان کو استنباطی

حقائق (Interred Facts) کہا جا سکتا ہے، یہاں یہ بات اہمیت کے ساتھ سمجھ لینے کی ہے کہ دونوں میں اصل فرق ان کے حقیقت ہونے کے اعتبار سے نہیں ہے، بلکہ اس لحاظ سے ہے کہ ایک صورت میں ہم "اس کو" جانتے ہیں، اور دوسری صورت میں "اس کے بارے میں" معلوم کرتے ہیں، حقیقت بہرحال حقیقت ہے، خواہ ہم اس کو براہ راست مشاہدہ سے جانیں یا بطریق استنباط معلوم کریں۔"

Clearer Thinking, London 1949, p.49

وہ مزید لکھتا ہے:

"کائنات میں جو حقیقتیں ہیں، ان میں سے نسبتاً تھوڑی تعداد کو ہم حواس کے ذریعہ معلوم کر سکتے ہیں، پھر ان کے علاوہ جو اور چیزیں ہیں، ان کو ہم کیسے جانیں، اس کا ذریعہ استنتاج (Inference) یا تعقل (Reasoning) ہے، استنتاج یا تعقل ایک طریق فکر ہے جس کے ذریعہ سے ہم کچھ معلوم واقعات سے آغاز کر کے بالآخر یہ عقیدہ بناتے ہیں کہ فلاں حقیقت یہاں موجود ہے اگرچہ وہ کبھی دیکھی نہیں گئی۔" (ایضاً صفحہ ۴۹)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عقلی اور منطقی طریقہ حقیقت کو معلوم کرنے کا ذریعہ کیوں کر ہے، جس چیز کو ہم نے آنکھ سے نہیں دیکھا اور نہ کبھی اس کے وجود کا تجربہ کیا، اس کے متعلق محض عقلی تقاضے کی بنا پر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ حقیقت ہے، مینڈر کے الفاظ میں اس کا جواب یہ ہے:—

"The resoning process is valid because the universe of fact is rational."

یعنی منطقی استخراج کے ذریعہ حقیقت کو معلوم کرنے کا طریقہ صحیح ہے، کیونکہ کائنات میں خود منطقیت ہے عالم واقعات ایک ہم آہنگ کل ہے، کائنات کے تمام حقائق ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں، اور ان کے درمیان زبردست نظم اور باقاعدگی پائی جاتی ہے، اس لئے مطالعہ کا کوئی ایسا طریقہ جو واقعات کی

ہم آہنگی اور ان کی موزونیت کو ہم پر واضح نہ کرے، صحیح نہیں ہو سکتا، مینڈریہ بتاتے ہوئے لکھتا ہے:

"نظر آنے والے واقعات محض عالمِ حقیقت کے کچھ اجزاء (Pathes of Fact) ہیں، وہ سب کچھ جن کو ہم حواس کے ذریعہ جانتے ہیں، وہ محض جزوی اور غیر مربوط واقعات ہوتے ہیں اگر الگ سے صرف انھیں کو دیکھا جائے تو وہ بے معنی معلوم ہوں گے، براہِ راست محسوس ہونے والے واقعات کے ساتھ اور بہت سے غیر محسوس واقعات کو ملا کر جب ہم دیکھتے ہیں، اس وقت ہم ان کی معنویت کو سمجھتے ہیں"

اس کے بعد وہ ایک سادہ سی مثال سے اس حقیقت کو سمجھاتا ہے:

"ہم دیکھتے ہیں کہ ایک چڑیا مرتی ہے تو وہ زمین پر گر پڑتی ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک پتھر کو زمین سے اٹھانے کے لئے طاقت خرچ کرنی ہوتی ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ چاند آسمان میں گھوم رہا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ پہاڑی سے اترنے کے مقابلے میں چڑھنا زیادہ مشکل ہے، اس طرح کے ہزاروں مشاہدات ہمارے سامنے آتے ہیں جن کے درمیان بظاہر کوئی تعلق نہیں، اس کے بعد ایک استنباطی حقیقت Inferred Facts انکشاف ہوتا ہے ــــــ یعنی تجاذب (Gravitation) کا قانون، اس کے فوراً بعد ہمارے یہ تمام مشاہدات اس استنباطی حقیقت کے ساتھ مل کر باہم مربوط ہو جاتے ہیں، اور اس طرح بالکل پہلی بار ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان مختلف واقعات کے درمیان نظم باقاعدگی اور موافقت ہے، محسوس واقعات کو اگر الگ سے دیکھا جائے تو وہ بے ترتیب، غیر مربوط اور متفرق معلوم ہوں گے، مگر محسوس واقعات اور استنباطی حقائق دونوں کو ملا دیا جائے تو وہ ایک منظم شکل اختیار کر لیتے ہیں" (صفحہ ۵۱)

اس مثال میں تجاذب کا قانون ایک تسلیم شدہ سائنسی حقیقت ہونے کے باوجود بذاتِ خود قطعاً ناقابلِ مشاہدہ ہے، سائنس دانوں نے جس چیز کو دیکھا یا تجربہ کیا وہ خود قانونِ کشش نہیں، کچھ دوسری چیزیں ہیں، اور ان دوسری چیزوں کی منطقی توجیہہ کے طور پر وہ ماننے پر مجبور ہوئے ہیں کہ یہاں کوئی ایسی چیز موجود ہے، جس کو ہم قانونِ تجاذب

تعبیر کر سکتے ہیں۔

یہ قانون تجاذب آج ایک مشہور ترین سائنسی حقیقت کے طور پر ساری دنیا میں جانا جاتا ہے، اس کو پہلی بار نیوٹن نے دریافت کیا، مگر خالص تجربی نقطۂ نظر سے اس کی حقیقت کیا ہے، اس کو نیوٹن کی زبان سے سنئے، اس نے بنٹلی کو ایک خط لکھا تھا، جو اس کے مجموعے میں ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے:۔

"یہ ناقابل فہم ہے کہ بے جان اور بے حس مادہ کسی درمیانی واسطہ کے بغیر دوسرے مادہ پر اثر ڈالتا ہے، حالانکہ دونوں کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہوتا" Works of W. Bently III, p.221

ایک ایسی ناقابل مشاہدہ اور ناقابل فہم چیز کو آج بلا اختلاف سائنسی حقیقت سمجھا جاتا ہے، کیوں، صرف اس لئے کہ اگر ہم ان کو مان لیں تو ہمارے کچھ مشاہدات کی اس سے توجیہہ ہو جاتی ہے، گویا کسی چیز کے حقیقت ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ براہِ راست ہمارے تجربے اور مشاہدے میں آ رہی ہو، بلکہ وہ غیر مرئی عقیدہ بھی اسی درجہ کی ایک حقیقت ہے، جس سے ہم مختلف مشاہدات کو اپنے ذہن میں مربوط کر سکتے ہوں، جو معلوم واقعات کی معنویت ہم پر واضح کر سکے، مینڈر لکھتا ہے۔

"یہ کہنا کہ ہم نے ایک حقیقت کو معلوم کر لیا ہے، دوسرے لفظوں میں گویا یہ کہنا ہے کہ ہم نے اس کی معنویت (Meaning) کو معلوم کر لیا ہے، یا اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہم کسی چیز کی موجودگی کے سبب اور اس کے حالات کو معلوم کر کے اس کی تشریح کرتے ہیں، ہماری بیشتر یقینیات (Beliefs) اسی نوعیت کی ہیں، وہ دراصل مشاہدات کی توضیح (Statements of Observation) ہیں"

اس بحث کے بعد مینڈر مشہور حقائق (Observed Facts) کے مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"جب ہم کسی مشاہدے (Observation) کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیشہ ہم محض حسیاتی مشاہدے سے کچھ زیادہ مراد لیتے ہیں، اس سے مراد حسیاتی مشاہدہ نیز معرفت (Recognition) ہوتا ہے، جس میں تعبیر کا جز بھی شامل ہو" p. 56

یہی وہ اصول ہے جس کی بنیاد پر عضویاتی ارتقا Organic Evolution کے حقیقت ہونے پر سائنس دانوں کا اجماع ہو گیا ہے، مینڈر کے نزدیک یہ نظریہ "اب اتنے دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس کو تقریباً حقیقت (Approximate Certainty) کہا جا سکتا ہے"[1] سمپسن G.G. Simpson کے الفاظ میں نظریۂ ارتقا آخری اور مکمل طور پر ایک ثابت شدہ حقیقت ہے نہ کہ محض ایک قیاس یا متبادل مفروضہ جو سائنسی تحقیق کے لئے قائم کر لیا گیا ہو"[2] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۵۸ء) کے مقالہ نگار نے حیوانات میں ارتقا کو بطور ایک حقیقت (Truth) تسلیم کیا ہے، اور کہا ہے کہ ڈارون کے بعد اس نظریے کو سائنس دانوں اور تعلیم یافتہ طبقے کا قبول عام (General Acceptance) حاصل ہو چکا ہے (R.S. Lull) لکھتا ہے: —

"ڈارون کے بعد سے نظریہ ارتقا دن بدن زیادہ قبولیت حاصل کرتا رہا ہے، یہاں تک کہ اب سوچنے اور جاننے والے لوگوں میں اس بارے میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا ہے کہ یہ واحد منطقی طریقہ ہے، جس کے تحت عمل تخلیق کی توجیہہ ہو سکتی ہے، اور اس کو سمجھا جا سکتا ہے۔"

Organic Evolution, p.15

یہ نظریہ جس کی صداقت پر سائنس دانوں کا اس قدر اتفاق ہو گیا ہے، کیا اسے کسی نے دیکھا ہے، یا اس کا تجربہ کیا ہے — ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے اور نہ ایسا ہو سکتا، ارتقا کا مزعومہ عمل اتنا پیچیدہ ہے اور اتنے بعید ترین ماضی سے متعلق ہے، جس کو دیکھنے یا تجربہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لل کے مذکورہ بالا الفاظ کے مطابق یہ صرف ایک "منطقی طریقہ" ہے جس سے تخلیقی مظاہر کی توجیہہ کی جاتی ہے نہ کہ واقعی مشاہدہ، چنانچہ سر آرتھر کیتھ جو خود بھی ارتقا کا حامی ہے، اس نے ارتقا کو مشاہداتی یا تجرباتی حقیقت کے بجائے ایک "عقیدہ" قرار دیا ہے، اس کے الفاظ ہیں۔

"Evolution is a basic dogma of rationalism."

Revolt Against Reason, p.112

---

[1] *Clearer Thinking*, p113 [2] *Meaning of Evolution*, p.127

یعنی نظریۂ ارتقا مذہب عقلیت کا ایک بنیادی عقیدہ ہے، چنانچہ ایک سائنسی انسائیکلوپیڈیا میں ڈارونزم کو ایک ایسا نظریہ کہا گیا ہے جس کی بنیاد توجیہہ بلامشاہدہ Explanation Without Demonstration پر قائم ہے۔[1]

پھر ایک ایسی غیر شاہد اور ناقابل تجربہ چیز کو علمی حقیقت کیوں سمجھا جاتا ہے، اس کی وجہ اے ای ہینڈر کے الفاظ میں یہ ہے:-

۱۔ یہ نظریہ تمام معلوم حقیقتوں سے ہم آہنگ (Consistent) ہے۔

۲۔ اس نظریے میں ان بہت سے واقعات کی توجیہہ مل جاتی ہے، جو اس کے بغیر سمجھے نہیں جا سکتے۔

۳۔ دوسرا کوئی نظریہ ابھی تک ایسا سامنے نہیں آیا جو واقعات سے اس درجہ مطابقت رکھتا ہو۔ (صفحہ ۱۱۲)

اگر یہ استدلال نظریہ ارتقاء کو حقیقت قرار دینے کے لئے کافی ہے تو یہی استدلال بدرجہا زیادہ شدت کے ساتھ مذہب کے حق میں موجود ہے ــــ ایسی حالت میں نظریۂ ارتقاء کو سائنسی حقیقت قرار دینا اور مذہب کو سائنسی ذہن کے لئے ناقابل قبول ٹھہرانا صرف اس بات کا مظاہرہ ہے کہ آپ کا مقدمہ اصلاً "طریق استدلال" کا مقدمہ نہیں ہے، بلکہ وہ نتیجہ سے متعلق ہے، ایک ہی طریق استدلال سے اگر کوئی خالص طبیعیاتی نوعیت کا واقعہ ثابت ہو تو آپ فوراً اسے قبول کرلیں گے اور اگر کوئی الٰہیاتی نوعیت کی چیز ثابت ہو تو آپ اسے رد کردیں گے، کیوں کہ یہ نتیجہ آپ کو پسند نہیں۔

اوپر کی بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کہنا صحیح نہیں کہ مذہب ایمان بالغیب کا نام ہے، اور سائنس ایمان بالشہود کا، حقیقت یہ ہے کہ مذہب اور سائنس دونوں ہی ایمان بالغیب پر عمل کرتے ہیں، مذہب کا اصل دائرہ اشیاء کی اصلی اور آخری حقیقت متعین کرنے کا دائرہ ہے، سائنس اسی وقت تک مشاہداتی علم ہے، جب تک وہ ابتدائی اور خارجی مظاہر پر کلام کر رہی ہو، جہاں وہ اشیاء کی آخری اور حقیقی حیثیت متعین کرنے کے میدان میں آتی ہے، جو کہ مذہب کا اصلی میدان ہے، تو وہ بھی ٹھیک اسی طرح "ایمان بالغیب" کا طریقہ اختیار

---

[1] *Revolt Against Reason*, p.111

کرتی ہے جس کا الزام مذہب کو دیا جاتا ہے کیونکہ اس میدان میں اس کے سوا چارہ نہیں۔ بقول سر آرتھر اڈنگٹن (Sir Arthur Eddington) دورِ جدید کا سائنس داں جس میز پر کام کر رہا ہے، وہ بیک وقت دو میزیں ہیں، ایک میز تو وہی ہے جو ہمیشہ سے عام انسانوں کی میز رہی ہے اور جس کو چھونا اور دیکھنا ممکن ہے۔ دوسری میز اس کی علمی میز (Scientific Table) ہے، اس کا بیشتر حصہ خلا ہے، اور اس میں بے شمار ناقابلِ مشاہدہ الکٹران دوڑ رہے ہیں، اسی طرح ہر چیز کے مثنٰی (Duplicate) ہیں، جن میں سے ایک تو قابلِ مشاہدہ ہے، اور دوسرا صرف تصوراتی ہے، اس کو کسی بھی خوردبین یا دوربین سے دیکھا نہیں جاسکتا۔

Nature of the Physical World, p.7-8

جہاں تک چیزوں کی شکلِ اول کا تعلق ہے، اس کو بیشک سائنس دیکھتی ہے، اور بہت دور تک دیکھتی ہے، مگر اس نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے شکلِ ثانی کو بھی دیکھ لیا ہے، اس میدان میں اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کسی حقیقت کے مظاہر کو دیکھ کر اس کے بارے میں ایک رائے قائم کرتی ہے، گویا جہاں تک اس دوسرے میدان ــــــ اشیا کی آخری حقیقت معلوم کرنے کے میدان ــــــ کا تعلق ہے، سائنس نام ہے، معلوم حقائق کی مدد سے نامعلوم حقائق دریافت کرنے کا۔

جب سائنس داں کے پاس مشاہداتی حقائق (جن کو درحقیقت وجدان صورت پذیر کرتا ہے) کی کچھ تعداد فراہم ہو جاتی ہے تو وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اب اسے ایک ایسے مفروضہ یا نظریہ یا زیادہ صحیح الفاظ میں ایک وجدانی یا اعتقادی تصور کی ضرورت ہے، جو ان مشاہدات کی تشریح کرے، ان کو منظم کرے اور انھیں ایک وحدت میں پرو دے، لہٰذا وہ اس قسم کا ایک وجدانی مفروضہ ایجاد کرتا ہے، اگر یہ مفروضہ فی الواقع ان تمام حقائق کی معقول تشریح کرتا ہو، یعنی ان کو منظم کر کے ایک وحدت بناتا ہو تو وہ مفروضہ بھی، جب تک وہ ان حقائق کی معقول تشریح کرتا ہو، بالکل ایسی ہی قابلِ یقین حقیقت شمار کیا جاتا ہے، جیسی کہ کوئی اور علمی حقیقت جس کو سائنس داں "مشاہدہ" قرار دیتا ہے، اگرچہ یہ حقیقت سائنس دانوں کے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق کبھی مشاہدہ میں نہ آئی ہو، مگر

یہ غیر مرئی حقیقت صرف اسلئے حقیقت سمجھی جاتی ہے کہ دوسرا مفروضہ ایسا موجود نہیں ہے، جوان مشہود حقائق کی واقعی تشریح کرتا ہو۔

گویا سائنس داں ایک غائب چیز کی موجودگی پر اس کے نتائج واثرات کی وجہ سے یقین کرلیتا ہے، ہر وہ حقیقت جس پر ہم یقین کرتے ہیں، شروع میں ایک مفروضہ ہی ہوتی ہے، پھر جوں جوں نئے حقائق منکشف ہو کر اس مفروضے کی تائید کرتے جاتے ہیں، اس مفروضہ کی صداقت نمایاں ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ اس پر ہمارا یقین، حق الیقین کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے، اگر آشکارہ ہونے والے حقائق اس مفروضہ کی تائید نہ کریں تو ہم اس مفروضہ کو غلط سمجھ کر ترک کردیتے ہیں، اس قسم کی ناقابل انکار حقیقت کی ایک مثال جس پر سائنس داں ایمان بالغیب رکھتا ہے، "ایٹم" ہے، ایٹم کو آج تک معروف معنوں میں دیکھا نہیں گیا، مگر اس کے باوجود وہ جدید سائنس کی سب سے بڑی تسلیم شدہ حقیقت ہے، اسی بنا پر ایک عالم نے سائنسی نظریات کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:۔

"Theories and mental pictures that explain known laws."

نظریات دراصل ذہنی نقشے ہیں، جو معلوم قوانین کی توجیہہ کرتے ہیں۔

سائنس کے میدان میں جن "حقائق" کو مشاہداتی حقائق (Observed Facts) کہا جاتا ہے، وہ دراصل مشاہداتی حقائق نہیں بلکہ کچھ مشاہدات کی تعبیریں ہیں، اور چونکہ انسانی مشاہدہ کو کامل نہیں کہا جاسکتا، اس لئے یہ تعبیریں بھی تمام کی تمام اضافی ہیں، اور مشاہدہ کی ترقی سے تبدیل ہوسکتی ہیں۔ جے۔ ڈبلو، این، سولیون (Sullivan) سائنسی نظریات پر ایک تبصرہ کرنے کے بعد لکھتا ہے:

"سائنسی نظریات کے اس جائزے سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ ایک صحیح سائنسی نظریہ محض یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ ایک کامیاب عملی مفروضہ Successful Working Hypothesis ہے، یہ بہت ممکن ہے کہ تمام سائنسی نظریات اصلاً غلط ہوں، جن نظریات کو آج ہم تسلیم کرتے ہیں، وہ محض ہمارے موجودہ حدود مشاہدہ کے اعتبار سے حقیقت ہیں، حقیقت (Truth) اب بھی سائنس کی

دنیا میں ایک علمی اور افادی مسئلہ (Pragmatic Affair) ہے[1]"۔

اس کے باوجود سائنس داں ایک مفروضہ کو جو اس کے مشاہداتی حقائق کی معقول تشریح کرتا ہو، مشاہداتی حقائق سے کم درجہ کی علمی حقیقت نہیں سمجھتا، وہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ مشاہداتی حقائق تو سائنس ہیں لیکن وہ نظریہ جو ان کی تشریح کرتا ہے وہ سائنس نہیں ــــــ اسی کا نام ایمان بالغیب ہے، ایمان بالغیب مشہود حقائق سے الگ کوئی چیز نہیں ہے، وہ محض ایک اندھا عقیدہ نہیں ہے، بلکہ وہ مشہود حقائق کی صحیح ترین توجیہہ ہے، جس طرح نیوٹن کے نظریۂ روشنی (Corpuscular Theory of Light) کو بیسویں صدی کے سائنس دانوں نے اس لئے رد کر دیا کہ وہ مظاہر نور کی تشریح میں ناکام نظر آیا، اسی طرح ہم بے خدا مفکرین کے نظریۂ کائنات کو اس بنا پر رد کرتے ہیں کہ وہ حیات و کائنات کے مظاہر کی تشریح میں ناکام ہے، مذہب کے بارے میں ہمارے یقین کا ماخذ عین وہی چیز ہے، جو ایک سائنس داں کے لئے کسی سائنسی نظریے کے بارے میں ہوتا ہے، ہم مشاہداتی حقائق کے مطالعہ ہی سے اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ مذہب کی تشریحات عین حق ہیں، اور اس درجہ حق ہیں کہ ہزاروں برس گزرنے کے باوجود ان کی صداقت میں کوئی فرق نہیں آیا، ہر وہ انسانی نظریہ جو اب سے چند سو برس پہلے بنایا گیا، وہ نئے مشاہدات و تجربات کے ظہور میں آنے کے بعد مشتبہ اور مردود ہو چکا ہے، اس کے برعکس مذہب ایک ایسی صداقت ہے، جو ہر نئی تحقیق سے اور نکھرتی چلی جا رہی ہے، ہر واقعی دریافت اس کے لئے تصدیق بنتی چلی جاتی ہے۔

اگلے صفحات میں ہم اسی پہلو سے مذہب کے بنیادی تصورات کا مطالعہ کریں گے۔

---

[1] The Limitations of Science, p.158

کائنات خدا کی گواہی دیتی ہے

عرصہ ہوا کہ، کیرالا کے عیسائی مشن نے ایک کتابچہ شائع کیا تھا، جس کا نام تھا۔

"Nature and Science speak about God."

اس باب کے عنوان کے لئے میں سمجھتا ہوں کہ یہ الفاظ موزوں ترین ہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا کا سب سے بڑا ثبوت اس کی وہ مخلوق ہے، جو ہمارے سامنے موجود ہے، فطرت اور اس کے بارے میں ہمارا بہترین علم پکار رہا ہے کہ بے شک اس دنیا کا ایک خدا ہے، اس کے بغیر ہم کائنات کو اور اپنے آپ کو سمجھ نہیں سکتے۔

کائنات کی موجودگی، اس کے اندر حیرت انگیز تنظیم اور اس کی انتہا معنویت کی اس کے سوا کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی کہ اس کو کسی نے بنایا ہے اور یہ بنانے والا ایک لامحدود ذہن ہے، نہ کہ کوئی اندھی طاقت۔

ا۔ فلسفیوں میں سے ایک گروہ، نہایت مختصر گروہ، ایسا ہے جو کسی قسم کے وجود ہی میں شک کرتا ہے، اس کے نزدیک نہ یہاں کوئی انسان ہے اور نہ کوئی کائنات، بس ایک عدم محض ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں اگر اس نقطۂ نظر کو صحیح مان لیا جائے تو یقیناً خدا کا وجود مشتبہ ہو جاتا ہے، لیکن جیسے ہی ہم کائنات کو مانتے ہیں، ہمارے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم خدا کو مانیں ـــــ کیونکہ عدم سے وجود کا پیدا ہونا ایک ناقابلِ قیاس بات ہے۔

جہاں تک اس مخصوص قسم کی تشکیک اور لاادریت کا تعلق ہے، وہ ایک فلسفیانہ نکتہ تو ہو سکتا ہے

مگر اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، جب ہم سوچتے ہیں تو ہمارا سوچنا خود اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ ہمارا کوئی وجود ہے، جب راستہ چلتے ہوئے کسی پتھر سے ٹکراتے ہیں، اور ہمیں تکلیف ستانے لگتی ہے تو یہ واقعہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ ہمارے باہر کوئی دنیا ہے، جس کا اپنا وجود ہے، اسی طرح ہمارا ذہن اور ہمارے تمام حواس ہر آن بے شمار چیزوں کو محسوس کرتے ہیں، اور یہ علم واحساس ہر شخص کے لئے اس بات کا ایک ذاتی ثبوت ہے کہ وہ ایک ایسی دنیا میں ہے، جو واقعی طور پر اپنا وجود رکھتی ہے، اب اگر کسی کا فلسفیانہ تفکر اس کے لئے دنیا کے وجود کو مشتبہ کر دیتا ہے، تو یہ ایک ایسی مستثنیٰ حالت ہے جو کروروں انسانوں کے تجربات سے غیر متعلق ہے، ایسے شخص کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی مخصوص قسم کی ذہنی فضا میں گم ہو گیا ہے، یہاں تک کہ اپنے آپ سے بھی بے خبر ہو گیا ہے۔

اگرچہ کائنات کا موجود نہ ہونا بذاتِ خود اس بات کا کوئی لازمی ثبوت نہیں ہے کہ خدا بھی موجود نہ ہو، تاہم اپنی انتہائی لغویت کے باوجود یہی ایک نقطۂ نظر ہے، جس کے لئے خدا کا وجود مشتبہ ہو سکتا ہے، مگر یہ نقطۂ نظر خود اتنا بے معنی ہے کہ آج تک نہ تو عام انسانوں کے لئے وہ قابلِ فہم ہو سکا اور نہ علمی دنیا میں اس کو قبولِ عام حاصل ہوا ہے، عام انسان اور عام اہل علم بہرحال اس واقعہ کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا اپنا ایک وجود ہے، اور کائنات بھی اپنا ایک وجود رکھتی ہے، سارے علوم اور زندگی کی تمام سرگرمیاں اسی علم ویقین کی بنیاد پر قائم ہیں۔

پھر جب ایک کائنات ہے تو لازماً اس کا ایک خدا ہونا چاہئے، یہ بالکل بے معنی بات ہے کہ ہم مخلوق کو مانیں مگر خالق کا وجود تسلیم نہ کریں، ہمیں کسی بھی ایسی چیز کا علم نہیں جو پیدا کئے بغیر وجود میں آگئی ہو، ہر چھوٹی بڑی چیز لازمی طور پر اپنا ایک سبب رکھتی ہے، پھر اتنی بڑی کائنات کے بارے میں کیسے یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ یونہی وجود میں آگئی، اس کا کوئی خالق نہیں۔

جان اسٹوارٹ مل (Stuart Mill) نے اپنی آٹو بیاگریفی میں لکھا ہے کہ میرے باپ نے مجھے یہ سبق دیا کہ یہ سوال کہ کس نے مجھے پیدا کیا (Who Made Me) خدا کے اثبات کے لئے کافی نہیں ہے

کیونکہ اس کے بعد فوراً دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا Who Made God چنانچہ برٹرینڈ رسل نے بھی اسی اعتراض کو تسلیم کرتے ہوئے محرک اول کے استدلال کو رد کر دیا ہے۔

The Age of Analysis, by Morton White, p.21-22.

یہ منکرین خدا کا بہت پرانا استدلال ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کا اگر کوئی خالق مانیں تو اس خالق کو لازمی طور پر ازلی ماننا پڑے گا، پھر جب خدا کو ازلی ماننا ہے تو کیوں نہ کائنات ہی کو ازلی مان لیا جائے اگرچہ یہ بالکل بے معنی بات ہے، کیونکہ کائنات کی کوئی ایسی صفت ہمارے علم میں نہیں آئی ہے جس کی بنا پر اس کو خود اپنا خالق فرض کیا جا سکے ـــــ تاہم انیسویں صدی تک منکرین کی اس دلیل میں ایک ظاہر فریب حسن ضرور موجود تھا، مگر اب حرکیات حرارت کے دوسرے قانون (Second Law of Thermodynamics) کے انکشاف کے بعد تو یہ دلیل بالکل بے بنیاد ثابت ہو چکی ہے۔

یہ قانون جسے ضابطۂ ناکارگی (Law of Entropy) کہا جاتا ہے، ثابت کرتا ہے کہ کائنات ہمیشہ سے موجود نہیں ہو سکتی، ضابطۂ ناکارگی بتاتا ہے کہ حرارت مسلسل باحرارت وجود سے بے حرارت وجود میں منتقل ہوتی رہتی ہے، مگر اس چکر کو الٹا چلایا نہیں جا سکتا کہ خود بخود یہ حرارت، کم حرارت کے وجود سے زیادہ حرارت کے وجود میں منتقل ہونے لگے، ناکارگی، دستیاب توانائی (Available Energy) اور غیر دستیاب توانائی (Unavailable Energy) کے درمیان تناسب کا نام ہے، اور اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کائنات کی ناکارگی برابر بڑھ رہی ہے، اور ایک وقت ایسا آنا مقدر ہے جب تمام موجودات کی حرارت یکساں ہو جائے گی، اور کوئی کارآمد توانائی باقی نہ رہے گی، اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ کیمیائی اور طبعی عمل کا خاتمہ ہو جائے گا اور زندگی بھی اسی کے ساتھ ختم ہو جائے گی، لیکن اس حقیقت کے پیش نظر کہ کیمیائی اور طبعی عمل جاری اور زندگی کے ہنگامے قائم ہیں، یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ کائنات ازل سے موجود نہیں ہے ورنہ اخراج حرارت کے لازمی قانون کی وجہ سے اس کی توانائی کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی، اور یہاں زندگی کی ہلکی سی رمق بھی موجود نہ ہوتی۔

اس جدید تحقیق کا حوالہ دیتے ہوئے ایک امریکی عالم حیوانات (Edward Luther Kessel) لکھتا ہے:۔

"اس طرح غیر ارادی طور پر سائنس کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کائنات اپنا ایک آغاز (Beginning) رکھتی ہے اور ایسا کرتے ہوئے اس نے خدا کی صداقت کو ثابت کر دیا ہے، کیونکہ جو چیز اپنا ایک آغاز رکھتی ہو وہ اپنے آپ شروع نہیں ہو سکتی، یقیناً وہ ایک محرک اول، ایک خالق، ایک خدا کی محتاج ہے۔"

The Evidence of God, p.51

یہی بات سر جیمز جینز نے ان الفاظ میں کہی ہے:

"موجودہ سائنس کا یہ خیال ہے کہ کائنات میں ناکارگی (Entropy) کا عمل ہمیشہ جاری رہے گا یہاں تک کہ اس کی توانائی بالکل ختم ہو جائے، یہ ناکارگی ابھی اپنے آخری درجہ کو نہیں پہنچی ہے اگر ایسا ہو گیا ہوتا تو ہم اس کے متعلق سوچنے کے لئے موجود نہ ہوتے، یہ ناکارگی اس وقت بھی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور اس بنا پر اس کا ایک آغاز ہونا ضروری ہے، کائنات میں لازماً اس قسم کا کوئی عمل ہوا ہے، جس کو ہم ایک وقت خاص میں تخلیق (Creation at a Time) کہہ سکتے ہیں، نہ یہ کہ وہ لامتناہی مدت سے موجود ہے۔"

Mysterious Universe, p.133

اس طرح کے اور بھی طبیعیاتی شواہد ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ کائنات ازل سے موجود نہیں ہے، بلکہ وہ ایک محدود عمر رکھتی ہے، مثلاً فلکیات کا یہ مشاہدہ ہے کہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے، تمام کہکشائیں اور فلکیاتی اجسام مشاہدہ میں نہایت تیزی کے ساتھ ایک دوسرے سے ہٹتے ہوئے نظر آتے ہیں، اس صورت حال کی اس وقت نہایت عمدہ توجیہ ہو جاتی ہے، جب ہم ایک ایسے ابتدائی وقت کو تسلیم کر لیں، جب تمام اجزائے ترکیبی مجتمع اور مرکوز حالت میں تھے، اور اس کے بعد ان میں حرکت و توانائی کا آغاز ہوا، اس طرح کے مختلف

قرائن کی بنا پر عام اندازہ یہ ہے کہ لگ بھگ پچاس کھرب سال پہلے ایک غیر معمولی دھماکے سے یہ سارا عالم وجود میں آیا، اب سائنس کی اس دریافت کو ماننا کہ کائنات محدود عمر رکھتی ہے، اور اس کے موجد کو نہ ماننا، ایسا ہی ہے، جیسے کوئی شخص یہ تو تسلیم کرے کہ تاج محل ہمیشہ سے موجود نہیں تھا، بلکہ سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں بنا، مگر اس کے باوجود اس کا کوئی معمار اور انجینیر تسلیم نہ کرے اور کہے کہ وہ بس اپنے آپ ایک مخصوص تاریخ کو بن کر کھڑا ہو گیا ہے!

۲. فلکیات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا کے تمام سمندروں کے کنارے ریت کے جتنے ذرے ہیں، شاید اسی قدر آسمان میں ستاروں کی تعداد ہے، ان میں کچھ ستارے ایسے ہیں، جو زمین سے کسی قدر بڑے ہیں، مگر بیشتر ستارے اتنے بڑے ہیں کہ ان کے اندر لاکھوں زمینیں رکھی جا سکتی ہیں، اور بعض ستارے تو اس قدر بڑے ہیں کہ اربوں زمینیں ان کے اندر سما سکتی ہیں، یہ کائنات اس قدر وسیع ہے کہ روشنی کی مانند ایک انتہائی ممکن حد تک تیز اڑنے والا ہوائی جہاز جس کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ ہو، وہ کائنات کے گرد گھومے تو اس ہوائی جہاز کو کائنات کا پورا چکر لگانے میں تقریباً ایک ارب سال لگیں گے، پھر اتنی وسعت کے باوجود یہ کائنات ٹھہری ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ ہر لمحہ اپنے چاروں طرف پھیل رہی ہے، اس پھیلنے کی رفتار اتنی تیز ہے کہ ہر ۱۳۰ کروڑ سال کے بعد کائنات کے تمام فاصلے دگنے ہو جاتے ہیں، اس طرح ہمارا یہ خیالی قسم کا غیر معمولی تیز رفتار ہوائی جہاز بھی کائنات کا چکر کبھی پورا نہیں کر سکتا، وہ ہمیشہ اس بڑھتی ہوئی کائنات کے راستہ میں رہے گا۔[۱]

آسمان گرد و غبار سے پاک ہو تو پانچ ہزار ستارے خالی آنکھ سے دیکھے جا سکتے ہیں، لیکن معمولی دوربینوں کی مدد سے یہ تعداد بیس لاکھ سے زیادہ ہو جاتی ہے، اور وقت کی سب سے بڑی دوربین جو ماؤنٹ پیلومر پر لگی ہوئی ہے، اس سے اربوں ستارے نظر آتے ہیں، مگر یہ تعداد اصل تعداد کے مقابلے میں بہت کم ہے، کائنات ایک بے انتہا وسیع خلا ہے، جس میں لاتعداد ستارے غیر معمولی رفتار سے مسلسل حرکت کر رہے ہیں، کچھ ستارے تنہا سفر کر رہے ہیں، کوئی دو یا زیادہ ستاروں کے مجموعوں کی شکل میں ہیں اور بے شمار ستارے ایسے ہیں جو مجامع النجوم کی

۱؎ یہ کائنات کی وسعت کے بارے میں آئن سٹائن کا نظریہ ہے، مگر یہ صرف ایک ریاضیاتی قیاس ہے، حقیقت یہ ہے کہ انسان ابھی تک کائنات کی وسعت کو سمجھ نہیں سکا ہے۔

صورت میں متحرک ہیں، روشن دان سے کمرے میں آنے والی روشنی کے اندر آپ نے بے شمار ذرے اِدھر اُدھر دوڑتے ہوئے دیکھے ہوں گے اسی کو اگر آپ بہت بڑے پیمانے پر قیاس کر سکیں تو کائنات کے اندر ستاروں کی گردش کا آپ ہلکا سا اندازہ کر سکتے ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ ذرے باہم ملے ہوئے حرکت کرتے ہیں' اور ستارے تعداد کی اس کثرت کے باوجود بالکل یکہ و تنہا دوسرے ستاروں سے بے اندازہ فاصلے پر سرگرم سفر ہیں، جیسے وسیع سمندروں میں چند جہاز جو ایک دوسرے سے اتنی دوری پر چل رہے ہوں کہ انھیں ایک دوسرے کی خبر نہ ہو۔

یہ ساری کائنات ستاروں کے بے شمار جھرمٹوں کی صورت میں ہے، ہر جھرمٹ کو کہکشاں کہتے ہیں' اور یہ سب کے سب مسلسل حرکت میں ہیں، سب سے قریبی حرکت جس سے ہم واقف ہیں' وہ چاند ہے، چاند زمین سے دو لاکھ چالیس ہزار میل دور رہ کر اس کے گرد مسلسل اس طرح گھوم رہا ہے کہ ہر ۲۹½ دن میں زمین کے گرد اس کا ایک چکر پورا ہو جاتا ہے، اسی طرح ہماری زمین جو سورج سے ساڑھے نو کروڑ میل دور ہے' وہ اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومتی ہوئی سورج کے گرد انیس کروڑ میل کا دائرہ بناتی ہے، جو ایک سال میں پورا ہوتا ہے، اسی طرح زمین سمیت نو سیارے ہیں' اور وہ سب کے سب سورج کے گرد مسلسل دوڑ رہے ہیں' ان سیاروں میں بعید ترین سیارہ پلوٹو ہے جو ساڑھے سات ارب میل کے دائرہ میں چکر لگا رہا ہے، یہ تمام سیارے اپنے سفر میں اس طرح مصروف ہیں کہ ان کے گرد اکتیس چاند بھی اپنے اپنے سیاروں کے گرد گھوم رہے ہیں، ان کے علاوہ تیس ہزار چھوٹے سیاروں (Asteroids) کا ایک حلقہ' ہزاروں دم دار ستارے اور لاتعداد شہاب ثاقب ہیں جو اسی طرح گردش میں مصروف ہیں' ان سب کے بیچ میں وہ ستارہ ہے، جس کو ہم سورج کہتے ہیں' اور جس کا قطر آٹھ لاکھ ۶۵ ہزار میل ہے' اور وہ زمین سے بارہ لاکھ گنا بڑا ہے۔

یہ سورج خود بھی رکا ہوا نہیں ہے بلکہ اپنے تمام سیاروں اور سیارچوں کو لئے ہوئے ایک عظیم کہکشانی نظام کے اندر چھ لاکھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گردش کر رہا ہے، اسی طرح ہزاروں حرکت کرتے ہوئے نظام ہیں' جن سے مل کر ایک کہکشاں وجود میں آتی ہے، کہکشاں گویا ایک بہت بڑی پلیٹ ہے، جس پر بے شمار ستارے منفرداً اور

مجمعاً لٹوؤں کی طرح مسلسل گھوم رہے ہیں، پھر یہ کہکشائیں خود بھی حرکت کرتی ہیں، چنانچہ وہ قریبی کہکشاں جس میں ہمارا شمسی نظام واقع ہے، وہ اپنے محور پر اس طرح گردش کر رہی ہے کہ اس کا ایک دور بیس کرور سال میں پورا ہوتا ہے۔

علمائے فلکیات کے اندازے کے مطابق کائنات پانچ سو ملین، (ایک ملین برابر دس لاکھ) کہکشانوں پر مشتمل ہے، اور ہر کہکشاں میں ایک لاکھ ملین یا اس سے کم وبیش ستارے پائے جاتے ہیں، قریبی کہکشاں جس کے ایک حصے کو ہم رات کے وقت سفید دھاری کی شکل میں دیکھتے ہیں، اس کا رقبہ ایک لاکھ سال نور ہے، اور ہم زمین کے رہنے والے کہکشاں کے مرکز سے تیس ہزار نوری سال کے بقدر دور ہیں، پھر یہ کہکشاں ایک اور بڑی کہکشاں کا جزو ہے، جس میں اسی طرح کی سترہ کہکشائیں حرکت کر رہی ہیں، اور پورے مجموعہ کا قطر بیس لاکھ سال نور ہے۔

ان تمام گردشوں کے ساتھ ایک اور حرکت جاری ہے، اور وہ یہ کہ ساری کائنات غبارے کی طرح چاروں طرف پھیل رہی ہے، ہمارا سورج ہیبت ناک تیزی کے ساتھ چکر کھاتا گھومتا ہوا بارہ میل فی سکنڈ کی رفتار سے اپنی کہکشاں کے بیرونی حاشیے کی طرف مسلسل بھاگ رہا ہے، اور اپنے ساتھ نظام شمسی کے تمام توابع کو بھی لئے جارہا ہے اسی طرح تمام ستارے اپنی گردش کو قائم رکھتے ہوئے کسی نہ کسی طرف کو بھاگ رہے ہیں، کسی کے بھاگنے کی رفتار آٹھ میل فی سکنڈ ہے، کسی کی ۳۳ میل فی سکنڈ کسی کی ۸۴ میل فی سکنڈ، اسی طرح تمام ستارے انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ دور بھاگے چلے جارہے ہیں۔

یہ ساری حرکت حیرت انگیز طور پر نہایت تنظیم اور باقاعدگی کے ساتھ ہو رہی ہے، نہ ان میں باہم کوئی ٹکراؤ ہوتا اور نہ رفتار میں کوئی فرق پڑتا، زمین کی حرکت سورج کے گرد ہر درجہ منضبط ہے، اسی طرح اپنے محور کے اوپر اس کی گردش اتنی صحیح ہے کہ صدیوں کے اندر بھی اس میں ایک سکنڈ کا فرق نہیں آنے پاتا، زمین کا سیارہ جس کو چاند کہتے ہیں، اس کی گردش بھی پوری طرح مقرر ہے، اس میں جو تھوڑا سا فرق ہوتا ہے، وہ بھی ہر ۱۸۱ سال کے بعد نہایت صحت کے ساتھ دہرا دیا جاتا ہے، یہی تمام اجرام سماوی کا حال ہے، حتی کہ ماہرین فلکیات کے اندازے کے مطابق اکثر خلائی گردش کے دوران ایک پورا کہکشانی نظام، جو اربوں متحرک ستاروں پر مشتمل ہوتا ہے،

دوسرے کہکشانی نظام میں حرکت کرتا ہوا داخل ہوتا ہے، اور پھر اس سے نکل جاتا ہے، مگر باہم کسی قسم کا ٹکراؤ پیدا نہیں ہوتا ——— اس عظیم اور حیرت انگیز تنظیم کو دیکھ کر عقل کو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ اپنے آپ نہیں قائم ہے بلکہ کوئی غیر معمولی طاقت ہے، جس نے اس اتھاہ نظام کو قائم رکھا ہے۔

یہی ضبط و نظم جو بڑی بڑی دنیاؤں کے درمیان نظر آتا ہے، وہی چھوٹی دنیاؤں میں بھی انتہائی مکمل شکل میں موجود ہے، اب تک کی معلومات کے مطابق سب سے چھوٹی دنیا ایٹم ہے، ایٹم اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ کسی بھی خوردبین سے نظر نہیں آتا، حالانکہ جدید خوردبین کسی چیز کو لاکھوں گنا بڑھا کر دکھانے کی صلاحیت رکھتی ہے، ایٹم کی حقیقت انسانی قوت بصارت کے اعتبار سے "لاشے" سے زیادہ نہیں، مگر اس انتہائی چھوٹے ذرے کے اندر حیرت انگیز طور پر ہمارے شمسی نظام کی طرح ایک زبردست گردشی نظام موجود ہے، ایٹم برق پاروں کے ایک مجموعے کا نام ہے، مگر یہ برق پارے ایک دوسرے سے ملے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ ان کے درمیان ایک طویل خلائی حجم ہوتا ہے، سیسہ کا ایک ٹکڑا، جس میں ایٹمی ذرات کافی سختی اور مضبوطی کے ساتھ آپس میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں، یہ برق پارے حجم کے سو کروڑ حصوں میں سے ایک حصہ بھی مشکل سے گھیرتے ہیں، بقیہ حصے بالکل خالی ہوتے ہیں، اگر الکٹرون اور پروٹون کی دو ٹکڑوں کی حیثیت سے تصویر بنائی جائے تو دونوں کا درمیانی فاصلہ تقریباً ۲۵۰ گز ہو سکتا ہے یا ایٹم کا تصور گرد کے ایک غیر مرئی ذرہ کی حیثیت سے کیا جائے تو الکٹرون کی گردش سے جو حجم بنتا ہے اس کی مقدار ایک ایسے فٹ بال کی سی ہو سکتی ہے، جس کا قطر آٹھ فٹ ہو۔

ایٹم کے منفی برق پارے جو الکٹرون کہلاتے ہیں، وہ مثبت برق پارے کے گرد گھومتے ہیں جن کو پروٹون کہا جاتا ہے، یہ برقیے، جو روشنی کی کرن کے ایک موہوم نقطے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے، اپنے مرکز کے گرد اسی طرح گردش کرتے ہیں، جیسے زمین اپنے مدار پر سورج کے گرد گردش کرتی ہے، اور یہ گردش اتنی تیز ہوتی ہے کہ الکٹرون کا کسی ایک جگہ تصور نہیں کیا جا سکتا، بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے، گویا وہ پورے مدار پر ایک ہی وقت میں ہر جگہ موجود ہے، وہ اپنے مدار پر ایک سکنڈ میں ہزاروں ارب چکر لگا لیتا ہے۔

یہ ناقابل قیاس اور ناقابل مشاہدہ تنظیم اگر سائنس کے قیاس میں اس لئے آجاتی ہے کہ اس کے بغیر ایٹم کے عمل کی توجیہہ نہیں کی جاسکتی تو ٹھیک اسی دلیل سے آخر ایک ایسے ناظم کا تصور کیوں نہیں کیا جاسکتا جس کے بغیر ایٹم کی اس تنظیم کا برپا ہونا محال ہے۔

ٹیلی فون کی لائن میں تاروں کا پیچیدہ نظام دیکھ کر ہمیں حیرت ہوتی ہے ہم کو تعجب ہوتا ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ لندن سے ملبورن کے لئے ایک کال چند منٹ میں مکمل ہوجاتی ہے، مگر یہاں ایک اور مواصلاتی نظام ہے، جو اس سے کہیں زیادہ وسیع اور اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے، یہ ہمارا اپنا عصبی نظام (Nervous System) ہے، جو قدرت نے قائم کر رکھا ہے، اس مواصلاتی نظام پر رات دن کروروں خبریں اِدھر سے اُدھر دوڑتی رہتی ہیں، جو دل کو بتاتی ہیں کہ وہ کب دھڑکے مختلف اعضا کو حکم دیتی ہیں کہ وہ کب حرکت کریں، پھیپھڑے سے کہتی ہیں کہ وہ کیسے اپنا عمل کرے، اگر جسم کے اندر یہ مواصلاتی نظام نہ ہو تو ہمارا پورا وجود منتشر چیزوں کا مجموعہ بن جائے جن میں سے ہر ایک الگ الگ اپنے راستے پر چل رہا ہو۔

اس مواصلاتی نظام کا مرکز انسان کا بھیجا ہے، آپ کے بھیجے کے اندر تقریباً ایک ہزار ملین عصبی خانے (Nerve Cells) ہیں، ہر خانے سے بہت باریک تار نکل کر تمام جسم کے اندر پھیلے ہوتے ہیں جن کو عصبی ریشے (Nerve Fibers) کہتے ہیں، ان پتلے ریشوں پر خبر وصول کرنے اور حکم بھیجنے کا ایک نظام تقریباً ستّر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتا رہتا ہے، انھیں اعصاب کے ذریعہ ہم چکھتے ہیں، سنتے ہیں، دیکھتے ہیں، محسوس کرتے ہیں، اور سارا عمل کرتے ہیں، زبان میں تین ہزار ذائقے خانے (Taste Buds) ہیں، جن میں ہر ایک اپنے علیحدہ عصبی تار کے ذریعہ دماغ سے جڑا ہوا ہے، انھیں کے ذریعہ وہ ہر قسم کے مزوں کو محسوس کرتا ہے، کان میں ایک لاکھ کی تعداد میں سماعت خانے ہوتے ہیں، انھیں خانوں سے ایک نہایت پیچیدہ عمل کے ذریعہ ہمارا دماغ سنتا ہے، ہر آنکھ میں ۱۳۰ ملین (Light Receptors) ہوتے ہیں جو تصویری مجموعے دماغ کو بھیجتے ہیں، ہماری تمام جلد میں حساتی ریشوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے، اگر ایک گرم چیز جلد کے سامنے لائی جائے تو تقریباً ۳۰ ہزار

"گرم خانے" اس کو محسوس کر کے فوراً دماغ کو اس کی خبر دیتے ہیں، اسی طرح جلد میں دو لاکھ پچاس ہزار خانے ایسے ہیں، جو سرد چیزوں کو محسوس کرتے ہیں، جب کوئی سرد چیز جسم سے ملتی ہے تو دماغ اس کی خبروں سے بھر جاتا ہے، جسم کانپنے لگتا ہے، جلد کی رگیں پھیل جاتی ہیں، فوراً مزید خون ان رگوں میں دوڑ کر آتا ہے تاکہ زیادہ گرمی پہونچائی جا سکے، اگر ہم شدید گرمی سے دوچار ہوں تو گرمی کے مخبرین دماغ کو اطلاع کرتے ہیں، اور تین ملین پسینہ کے غدود (Glands) ایک ٹھنڈا عرق خارج کرنا شروع کرتے ہیں۔

عصبی نظام کی کئی تقسیمیں ہیں، ان میں سے ایک (Autonomic Branch) ہے، یہ ایسے افعال انجام دیتی ہے جو خود بخود جسم کے اندر ہوتے رہتے ہیں، مثلاً ہضم، سانس لینا اور دل کی حرکت وغیرہ، پھر اس عصبی شاخ کے بھی دو حصے ہیں، ایک کا نام ہے اشارک نظام (Sympathetic System) جو کہ حرکت پیدا کرتا ہے، اور دوسرا (Parasympathetic) ہے، جو روک کا کام کرتا ہے، اگر جسم تمام تر پہلے کے قابو میں چلا جائے تو، مثال کے طور پر، دل کی حرکت اتنی تیز ہو جائے کہ موت آجائے، اور اگر بالکل دوسرے کا اختیار ہو جائے تو دل کی حرکت ہی رک جائے، دونوں شاخیں نہایت صحت کے ساتھ مل کر اپنا اپنا کام کرتی ہیں، جب دباؤ کے وقت فوری طاقت کی ضرورت ہوتی ہے تو (Sympathetic) کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے، اور دل اور پھیپھڑے تیزی سے کام کرنے لگتے ہیں، اسی طرح نیند کے وقت (Parasympathetic) کا غلبہ ہوتا ہے، جب کہ وہ تمام جسمانی حرکتوں پر سکوت طاری کر دیتا ہے۔

(مزید تفصیل کے لئے ریڈرز ڈائجسٹ اکتوبر ۱۹۵۶ء دیکھئے)

اس طرح کے بے شمار پہلو ہیں، اور اسی طرح کائنات کی ہر چیز میں ایک زبردست نظام قائم ہے، جس کے سامنے انسانی مشینوں کا بہتر سے بہتر نظام بھی مات ہے، اور اب تو قدرت کی نقل سائنس کا ایک مستقل موضوع بن چکا ہے، اس سے پہلے سائنس کا میدان صرف یہ سمجھا جاتا تھا کہ فطرت میں جو طاقتیں چھپی ہوئی ہیں، ان کو دریافت کر کے استعمال کیا جائے، مگر اب قدرت کے نظاموں کو سمجھ کر ان کی میکانکی نقل کو خاص اہمیت دی جا رہی ہے،

اس طرح ایک نیا علم وجود میں آیا ہے، جس کو بایونکس (Bionics) کہتے ہیں، بایونکس، حیاتیاتی نظام (Biological Systems) اور طریقوں کا اس غرض سے مطالعہ کرتی ہے کہ جو معلومات حاصل ہوں انھیں انجینیرنگ کے مسائل حل کرنے میں استعمال کیا جائے۔

قدرت کی نقل کرنے کی اس قسم کی مثالیں ٹکنالوجی میں پائی جاتی ہیں، مثلاً کیمرہ دراصل بنیادی طور پر آنکھ کی میکانکی نقل ہے، کیمرے کا لنس (LENS) آنکھ کے ڈھیلے کا بیرونی پردہ ہے، ڈائفرام (Diaphragm) پردۂ شبکی (Iris) ہے اور روشنی سے متاثر ہونے والی فلم آنکھ کا پردہ ہے جس میں عکس دیکھنے کے لئے ڈوے اور مخروطی شکلیں ہوتی ہیں[1]، ماسکو یونیورسٹی میں زیرصوتی ارتعاش (Infrasonic Vibrations) معلوم کرنے اور اس کی پیمائش کرنے کا ایک نمونے کا آلہ تیار کیا گیا ہے، جو طوفان کی آمد کی اطلاع ۱۲ سے ۱۵ گھنٹے پہلے تک دے دیتا ہے، یہ مروجہ آلوں سے پانچ گنا زیادہ طاقت ور ہے، اس کا خیال کس نے پیدا کیا؟ جیلی مچھلی (Jelly Fish) نے، انجینیروں نے اس کے اعضا کی نقل کی، جو زیرصوتی ارتعاش محسوس کرنے میں بڑے حساس ہوتے ہیں۔

Soviet Land, December 1963

اس طرح کی اور بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، طبیعیاتی سائنس اور ٹکنالوجی درحقیقت نئے تصورات کی نقل قدرت کے زندہ نمونوں سے حاصل کرتی ہے، بہت سے مسائل جو سائنس دانوں کے تخیل پر بوجھ بنے ہوئے ہیں، قدرت ان کو مدتوں پہلے حل کر چکی ہے، پھر جس طرح کیمرہ اور ٹیلی پرنٹر کا ایک نظام انسانی ذہن کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا، اسی طرح یہ بھی ناقابل تصور ہے کہ کائنات کا پیچیدہ ترین نظام کسی ذہن کے بغیر اپنے آپ قائم ہو، کائنات کی تنظیم قدرتی طور پر ایک انجینیر اور ایک ناظم کا تقاضا کرتی ہے، اسی کا نام خدا ہے، ہم کو جو ذہن ملا ہے، وہ ناظم کے بغیر تنظیم کا تصور نہیں کر سکتا، اس لئے غیر معقول بات یہ نہیں ہے کہ ہم کائناتی تنظیم کے لئے ایک ناظم کا

---

[1] کوئی ذی ہوش یہ کہنے کی غلطی نہیں کرے گا کہ کیمرہ اتفاق سے بن کر تیار ہو گیا ہے، مگر اس کے باوجود دنیا کے بہت سے ہوش مند یہ یقین رکھتے ہیں کہ آنکھ محض اتفاق سے وجود میں آگئی ہے!

اقرار کریں، بلکہ یہ غیر معقول رویہ ہوگا کہ ہم اس تنظیم کے ناظم کو ماننے سے انکار کر دیں، حقیقت یہ ہے کہ انسانی ذہن کے پاس خدا سے انکار کے لئے کوئی عقلی بنیاد نہیں ہے۔

۳۔ کائنات کوڑا کرکٹ کے ڈھیر کے مانند نہیں ہے بلکہ اس کے اندر حیرت انگیز معنویت ہے، یہ واقعہ صریح طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی تخلیق و تدبیر میں کوئی ذہن کام کر رہا ہے، ذہنی عمل کے بغیر کسی چیز میں ایسی معنویت پیدا نہیں ہو سکتی، محض اندھے مادی عمل سے اتفاقی طور پر وجود میں آجانے والی کائنات میں تسلسل نظم اور معنویت پائے جانے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، کائنات اس قدر حیرت انگیز طور پر موزوں اور مناسب حال ہے کہ یہ ناقابل تصور ہے کہ یہ مناسبت اور موزونیت خود بخود محض اتفاقاً واقعہ میں آگئی ہو ——— چاڈواش (Chadvalsh) کے الفاظ میں :-

"ایک شخص، خواہ وہ خدا کا اقرار کرنے والا ہو یا اس کا منکر ہو، جائز طور پر اس سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ وہ دکھائے کہ اتفاق کا توازن اس کے حق میں کس طرح ہو جاتا ہے"[1]

زمین پر زندگی کے پائے جانے کے لئے اتنے مختلف حالات کی موجودگی ناگزیر ہے کہ ریاضیاتی طور پر یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ اپنے مخصوص تناسب میں محض اتفاقاً زمین کے اوپر اکٹھا ہو جائیں، اب اگر ایسے حالات پائے جاتے ہیں تو لازماً یہ ماننا ہوگا کہ فطرت میں کوئی ذی شعور رہنمائی موجود ہے جو ان حالات کو پیدا کرنے کا سبب ہے، زمین اپنی جسامت کے اعتبار سے کائنات میں ایک ذرے کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتی مگر اس کے باوجود وہ ہماری تمام معلوم دنیاؤں میں اہم ترین ہے، کیونکہ اس کے اوپر حیرت انگیز طور پر وہ حالات مہیا ہیں، جو ہمارے علم کے مطابق اس وسیع کائنات میں کہیں نہیں پائے جاتے۔

سب سے پہلے زمین کی جسامت کو لیجئے، اگر اس کا حجم کم یا زیادہ ہوتا تو اس پر زندگی محال ہو جاتی مثلاً کرۂ زمین اگر چاند اتنا چھوٹا ہوتا، یعنی اس کا قطر موجودہ قطر کی نسبت سے ¼ ہوتا تو اس کی کشش ثقل،

---

[1] The Evidence of God p.88

زمین کی موجودہ کشش کا ½ رہ جاتی، کشش کی اس کمی کا نتیجہ یہ ہوجاتا کہ ہماری دنیا پانی اور ہوا کو اپنے اوپر روک نہ سکتی، جیسا کہ جسامت کی اسی کمی کی وجہ سے چاند میں واقع ہوا ہے، چاند پر اس وقت نہ تو پانی ہے اور نہ کوئی ہوائی کرہ ہے، ہوا کا غلاف نہ ہونے کی وجہ سے وہ رات کے وقت بیحد سرد ہوجاتا ہے اور دن کے وقت تنور کے مانند جلنے لگتا ہے، اسی طرح کم جسامت کی زمین جب کشش کی کمی کی وجہ سے پانی کی اس کثیر مقدار کو روک نہ سکتی جو زمین پر موسمی اعتدال کو باقی رکھنے کا ایک اہم ذریعہ ہے، اور اسی بنا پر ایک سائنس داں نے اس کو عظیم توازنی پہیہ (Great Balance Wheel)[1] کا نام دیا ہے، اور ہوا کا موجودہ غلاف اڑ کر فضا میں گم ہوجاتا تو اس کا حال یہ ہوتا کہ اس کی سطح پر درجہ حرارت چڑھتا تو انتہائی حد تک چڑھ جاتا، اور گرتا تو انتہائی حد تک گر جاتا، اس کے برعکس اگر زمین کا قطر موجودہ کی نسبت سے دگنا ہوتا تو اس کی کشش ثقل بھی دگنی بڑھ جاتی، کشش کے اس اضافہ کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہوا، جو اس وقت زمین کے اوپر پانچ سو میل کی بلندی تک پائی جاتی ہے، وہ کھنچ کر بہت نیچے تک سمٹ جاتی، اس کے دباؤ میں فی مربع انچ ۱۵ تا ۳۰ پونڈ کا اضافہ ہوجاتا جس کا رد عمل مختلف صورتوں میں زندگی کے لئے نہایت مہلک ثابت ہوتا، اور اگر زمین سورج کے اتنی بڑی ہوتی اور اس کی کثافت برقرار رہتی تو اس کی کشش ثقل ڈیڑھ سو گنا بڑھ جاتی، ہوا کے غلاف کی دبازت گھٹ کر پانچ سو میل کے بجائے صرف چار میل رہ جاتی، نتیجہ یہ ہوتا کہ ہوا کا دباؤ ایک ٹن فی مربع انچ تک جا پہنچتا، اس غیر معمولی دباؤ کی وجہ سے زندہ اجسام کا نشوونما ممکن نہ رہتا، ایک پونڈ وزنی جانور کا وزن ایک سو پچاس پونڈ ہوجاتا انسان کا جسم گھٹ کر گلہری کے برابر ہوجاتا اور اس میں کسی قسم کی ذہنی زندگی ناممکن ہوجاتی، کیونکہ انسانی ذہانت حاصل کرنے کے لئے بہت کثیر مقدار میں اعصابی ریشوں کی موجودگی ضروری ہے، اور اس طرح کے پھیلے ہوئے ریشوں کا نظام ایک خاص درجہ کی جسامت ہی میں پایا جا سکتا ہے۔

بظاہر ہم زمین کے اوپر ہیں، مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ہم اس کے نیچے سر کے بل لٹکے ہوئے ہیں، زمین

---

[1] The Evidence of God

گویا فضا میں معلق ایک گیند ہے، جس کے چاروں طرف انسان بستے ہیں، کوئی شخص ہندوستان کی زمین پر کھڑا ہو تو امریکہ کے لوگ بالکل اس کے نیچے ہوں گے، اور امریکہ میں کھڑا ہو تو ہندوستان اس کے نیچے ہوگا، پھر زمین ٹھہری ہوئی نہیں ہے، بلکہ ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے مسلسل گھوم رہی ہے، ایسی حالت میں زمین کی سطح پر ہمارا انجام وہی ہونا چاہئے، جیسے سائیکل کے پہیے پر کنکریاں رکھ کر پہیے کو تیزی سے گھما دیا جائے، مگر ایسا نہیں ہوتا کیونکہ ایک خاص تناسب سے زمین کی کشش اور ہوا کا دباؤ ہم کو ٹھہرائے ہوئے ہیں، زمین کے اندر غیر معمولی قوت کشش ہے جس کی وجہ سے وہ تمام چیزوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے، اور اوپر سے ہوا کا مسلسل دباؤ پڑتا ہے، اسی دوطرفہ عمل نے ہم کو زمین کے گولے پر چاروں طرف لٹکا رکھا ہے، ہوا کے ذریعہ جو دباؤ پڑتا ہے، وہ جسم کے ہر ایک مربع انچ پر تقریباً ساڑھے سات سیر تک معلوم کیا گیا ہے، یعنی ایک اوسط آدمی کے سارے جسم پر تقریباً ۲۸۰ من کا دباؤ، آدمی اس وزن کو محسوس نہیں کرتا، کیونکہ ہوا جسم کے چاروں طرف ہے، دباؤ ہر طرف سے پڑتا ہے، اس لئے آدمی کو محسوس نہیں ہوتا، جیسا کہ پانی میں غوطہ لگانے کی صورت میں ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ہوا ——— جو مختلف گیسوں کے مخصوص مرکب کا نام ہے، اس کے بے شمار دیگر فائدے ہیں، جن کا بیان کسی کتاب میں ممکن نہیں۔

نیوٹن اپنے مشاہدہ اور مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ تمام اجسام ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، مگر اجسام کیوں ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں، اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، چنانچہ اس نے کہا کہ میں اس کی کوئی توجیہہ پیش نہیں کر سکتا، وائٹ ہڈ (A.N.Whitehead) اس کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے:-

"نیوٹن نے یہ کہہ کر ایک عظیم فلسفیانہ حقیقت کا اظہار کیا ہے، کیونکہ فطرت اگر بے روح فطرت ہے، تو وہ ہم کو توجیہہ نہیں دے سکتی، ویسے ہی جیسے مردہ آدمی کوئی واقعہ نہیں بتا سکتا، تمام عقلی اور منطقی توجیہات آخری طور پر ایک مقصدیت کا اظہار ہیں، جبکہ مردہ کائنات میں کسی مقصدیت کا تصور نہیں کیا جا سکتا"

The Age of Analysis, p.85

وائٹ ہڈ کے الفاظ کو آگے بڑھاتے ہوئے میں کہوں گا کہ کائنات اگر کسی صاحبِ شعور کے زیرِ اہتمام نہیں ہے، تو اس کے اندر اتنی معنویت کیوں پائی جاتی ہے۔

زمین اپنے محور پر چوبیس گھنٹے میں ایک چکر پورا کر لیتی ہے، یا یوں کہئے کہ وہ اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی ہے، فرض کرو اس کی رفتار دو سو میل فی گھنٹہ ہو جائے اور یہ بالکل ممکن ہے، **ایسی صورت** میں ہمارے دن اور ہماری راتیں موجودہ کی نسبت سے دس گنا زیادہ لمبے ہو جائیں گے، **گرمیوں کا سخت سورج** ہر دن تمام نباتات کو جلا دے گا اور جو بچے گا وہ لمبی رات کی ٹھنڈک میں پالے کی نذر ہو جائے گا، **سورج جو** اس وقت ہمارے لئے زندگی کا سرچشمہ ہے، اس کی سطح پر بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ کا ٹمپریچر ہے، اور زمین سے اس کا فاصلہ تقریباً نو کروڑ تیس لاکھ میل ہے اور یہ فاصلہ حیرت انگیز طور پر مسلسل قائم ہے، یہ واقعہ ہمارے لئے بے حد اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اگر یہ فاصلہ گھٹ جائے، مثلاً سورج نصف کے بقدر قریب آجائے تو زمین پر اتنی گرمی پیدا ہو کہ اس گرمی سے کاغذ جلنے لگے، اور اگر موجودہ فاصلہ دگنا ہو جائے تو اتنی ٹھنڈک پیدا ہو کر زندگی باقی نہ رہے، یہی صورت اس وقت پیدا ہو گی جب موجودہ سورج کی جگہ کوئی دوسرا غیر معمولی ستارہ آجائے مثلاً ایک بہت بڑا ستارہ ہے، جس کی گرمی ہمارے سورج سے دس ہزار گنا زیادہ ہے، اگر وہ سورج کی جگہ ہوتا تو زمین کو آگ کی بھٹی بنا دیتا۔

زمین ۲۳ درجہ کا زاویہ بناتی ہوئی فضا میں جھکی ہوئی ہے، یہ جھکاؤ ہمیں ہمارے موسم دیتا ہے، اس کے نتیجے میں زمین کا زیادہ سے زیادہ حصہ آبادکاری کے قابل ہو گیا ہے اور مختلف قسم کے نباتات اور پیداوار حاصل ہوتی ہیں، اگر زمین اس طرح سے جھکی ہوئی نہ ہوتی تو قطبین پر ہمیشہ اندھیرا چھایا رہتا، سمندر کے بخارات شمال اور جنوب کی جانب سفر کرتے اور زمین پر یا تو برف کے ڈھیر ہوتے یا صحرائی میدان، اس طرح کے اور بہت سے اثرات ہوتے جس کے نتیجے میں بغیر جھکی ہوئی زمین پر زندگی ناممکن ہو جاتی۔

یہ کس قدر ناقابل قیاس بات ہے کہ مادہ نے خود کو اپنے آپ اس قدر موزوں اور مناسب شکل میں منظم کر لیا!

اگر سائنس دانوں کا قیاس صحیح ہے کہ زمین سورج سے ٹوٹ کر نکلی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابتداءً زمین کا درجۂ حرارت وہی رہا ہوگا جو سورج کا ہے، یعنی بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ، اس کے بعد وہ دھیرے دھیرے ٹھنڈی ہونا شروع ہوئی، آکسیجن اور ہائیڈروجن کا ملنا اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک زمین کا درجۂ حرارت گھٹ کر چار ہزار ڈگری پر نہ آجائے، اسی موقع پر دونوں گیسوں کے باہم ملنے سے پانی بنا، اس کے بعد کروڑوں سال تک زمین کی سطح اور اس کی فضا میں زبردست انقلابات ہوتے رہے یہاں تک کہ غالباً ایک بلین سال پہلے زمین اپنی موجودہ شکل میں تیار ہوئی، زمین کی فضا میں جو گیسیں تھیں ان کا ایک بڑا حصہ خلا میں چلا گیا، ایک حصہ نے پانی کے مرکب کی صورت اختیار کی، ایک حصہ زمین کی تمام چیزوں میں جذب ہو گیا، اور ایک حصہ ہوا کی شکل میں ہماری فضا میں باقی رہ گیا جس کا بیشتر جزو آکسیجن اور نائٹروجن ہے یہ ہوا اپنی کثافت کے اعتبار سے زمین کا تقریباً دس لاکھواں حصہ ہے —— کیوں نہیں ایسا ہوا کہ تمام گیسیں جذب ہو جائیں یا کیوں ایسا نہیں ہوا کہ موجودہ کی نسبت سے ہوا کی مقدار بہت زیادہ ہوتی، دونوں صورتوں میں انسان زندہ نہیں رہ سکتا تھا، یا اگر بڑھی ہوئی گیسوں کے ہزاروں پونڈ فی مربع انچ بوجھ کے نیچے زندگی پیدا بھی ہوتی تو یہ ناممکن تھا کہ وہ انسان کی شکل میں نشو ونما پا سکے۔

زمین کی اوپری پرت اگر صرف دس فٹ موٹی ہوتی تو ہماری فضا میں آکسیجن کا وجود نہ ہوتا جس کے بغیر حیوانی زندگی ناممکن ہے، اسی طرح اگر سمندر کچھ فٹ اور گہرے ہوتے تو وہ کاربن ڈائی آکسائڈ اور آکسیجن کو جذب کر لیتے اور زمین کی سطح پر کسی قسم کی نباتات زندہ نہ رہ سکتیں، اگر زمین کے اوپر کی ہوائی فضا موجودہ کی نسبت سے لطیف ہوتی تو شہاب ثاقب جو ہر روز اوسطاً دو کروڑ کی تعداد میں اوپری فضا میں داخل ہوتے ہیں اور رات کے وقت ہم کو جلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، وہ زمین کے ہر حصے میں گرتے، یہ شہابیے چھ سے چالیس میل تک فی سکنڈ کی رفتار سے سفر کرتے ہیں، وہ زمین کے اوپر ہر آتش پذیر مادے کو جلا دیتے اور سطح زمین کو چھلنی کر دیتے

شہاب ثاقب کی بندوق کی گولی سے نوے گنا زیادہ رفتار آدمی جیسی مخلوق کو محض اپنی گرمی سے ٹکڑے کر دیتی، مگر ہوائی کرہ اپنی نہایت موزوں دبازت کی وجہ سے ہم کو اس آتشیں بوچھار سے محفوظ رکھتا ہے، ہوائی کرہ ٹھیک اتنی کثافت رکھتا ہے کہ سورج کی کیمیائی اہمیت رکھنے والی شعاعیں Actinic Rays اسی موزوں مقدار سے زمین پر پہنچتی ہیں، جتنی نباتات کو اپنی زندگی کے لئے ضرورت ہے، جس سے مضر بیکٹیر مر سکتے ہیں، جس سے وٹامن تیار ہو سکتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

کمیت کا اس طرح عین ہماری ضرورتوں کے مطابق ہونا کس قدر عجیب ہے۔

زمین کی اوپری فضا چھ گیسوں کا مجموعہ ہے، جس میں تقریباً ۷۸ فیصدی نائٹروجن اور ۲۱ فیصدی آکسیجن ہے، باقی گیسیں بہت خفیف تناسب میں پائی جاتی ہیں، اس فضا سے زمین کی سطح پر تقریباً پندرہ پونڈ فی مربع انچ کا دباؤ پڑتا ہے، جس میں آکسیجن کا حصہ تین پونڈ فی مربع انچ ہے، موجودہ آکسیجن کا بقیہ حصہ زمین کی تہوں میں جذب ہے، اور وہ دنیا کے تمام پانی کا ۸/۹ حصہ بناتا ہے، آکسیجن تمام خشکی کے جانوروں کے لئے سانس لینے کا ذریعہ ہے، اور اس مقصد کے لئے فضا کے سوا کہیں اور سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ انتہائی متحرک گیسیں کس طرح آپس میں مرکب ہوئیں اور ٹھیک اس مقدار اور اس تناسب میں فضا کے اندر باقی رہ گئیں جو زندگی کے لئے ضروری تھا، مثال کے طور پر آکسیجن اگر ۲۱ فیصدی کے بجائے پچاس فیصدی یا اس سے زیادہ مقدار میں فضا کا جز ہوتا تو سطح زمین کی تمام چیزوں میں آتش پذیری کی صلاحیت اتنی بڑھ جاتی کہ ایک درخت میں آگ پکڑتے ہی سارا جنگل بھک سے اڑ جاتا، اسی طرح اگر اس کا تناسب گھٹ کر دس فیصدی رہتا تو ممکن ہے زندگی صدیوں کے بعد اس سے ہم آہنگی اختیار کر لیتی مگر انسانی تہذیب موجودہ شکل میں ترقی نہیں کر سکتی تھی، اور اگر آزاد آکسیجن بھی بقیہ آکسیجن کی طرح زمین کی چیزوں میں جذب ہو گئی ہوتی تو حیوانی زندگی سرے سے ناممکن ہو جاتی۔

آکسیجن، ہائیڈروجن، کاربن ڈائی آکسائڈ اور کاربن گیسیں الگ الگ اور مختلف شکلوں میں مرکب

ہو کر حیات کے اہم ترین عناصر ہیں، یہی وہ بنیادیں ہیں، جن پر زندگی قائم ہے، اس کا ایک فی ارب بھی امکان نہیں ہے کہ وہ تمام ایک وقت میں کسی ایک سیارہ پر اس مخصوص تناسب کے ساتھ اکٹھا ہو جائیں، ایک عالم طبیعیات کے الفاظ میں:۔

> "Science has no explanation to offer for the facts, and to say it is accidental is to defy mathematics."
>
> p.23

یعنی سائنس کے پاس ان حقائق کی توجیہ کے لئے کوئی چیز نہیں ہے، اور اس کو اتفاق کہنا ریاضیات سے کشتی لڑنے کے ہم معنی ہے۔

ہماری دنیا میں بے شمار ایسے واقعات موجود ہیں جن کی توجیہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ اس کی تخلیق میں ایک برتر ذہانت کا دخل تسلیم کیا جائے۔

پانی کی مختلف نہایت اہم خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ برف کی کثافت (Density) پانی سے کم ہوتی ہے، پانی وہ واحد معلوم مادہ ہے، جو جمنے کے بعد ہلکا ہو جاتا ہے، یہ چیز بقائے حیات کے لئے زبردست اہمیت رکھتی ہے، اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ برف پانی کی سطح پر تیرتا رہتا ہے، اور دریاؤں جھیلوں اور سمندروں کی تہ میں بیٹھ نہیں جاتا، ورنہ آہستہ آہستہ سارا پانی ٹھوس اور منجمد ہو جائے، یہ پانی کی سطح پر ایک ایسی حاجب تہہ بن جاتا ہے کہ اس کے نیچے کا درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے اوپر ہی اوپر رہتا ہے، اس نادر خاصیت کی وجہ سے مچھلیاں اور دیگر آبی جانور زندہ رہتے ہیں، اس کے بعد جونہی موسم بہار آتا ہے، برف فوراً پگھل جاتا ہے، اگر پانی میں یہ خاصیت نہ ہوتی تو خاص طور پر سرد ملکوں کے لوگوں کو بہت بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں جب کہ امریکہ میں انڈوتھیا (Endothia) نام کی بیماری شاہ بلوط (Chestnut) کے درختوں پر حملہ آور ہوئی اور تیزی سے پھیلی تو بہت سے لوگوں نے جنگل کی چھتری

میں شگاف دیکھ کر کہا "یہ شگاف اب پُر نہیں ہوں گے" امریکی شاہ بلوط کی بالادستی کو ابھی تک کسی اور قسم کے اشجار نے نہیں چھینا تھا، اونچے درجے کی دیرپا عماراتی لکڑی اور اس طرح کے دوسرے فوائد اس کے لئے خاص تھے، یہاں تک کہ ۱۹۰۰ء میں ایشیا سے انڈونھیا نام کی بیماری کا ورود ہوا اس وقت تک یہ جنگلات کا بادشاہ خیال کیا جاتا تھا، مگر اب جنگلات میں یہ درخت تقریباً ناپید ہو چکا ہے۔

لیکن جنگلات کے یہ شگاف جلد ہی پُر ہو گئے، کچھ دوسرے درخت (Tulip Trees) اپنی نشوونما کے لئے شاید انھیں شگافوں کا انتظار کر رہے تھے، شگاف پیدا ہونے سے پہلے تک یہ درخت جنگلات کا معمولی سا جز و تھے، اور شاذ ہی بڑھتے اور پھولتے تھے، لیکن اب شاہ بلوط کی عدم موجودگی کا کسی کو احساس تک نہیں ہوتا، کیونکہ اب دوسری قسم کے درخت پوری طرح ان کی جگہ لے چکے ہیں، یہ دوسرے درخت سال بھر میں ایک انچ محیط میں اور چھ فٹ لمبائی میں بڑھتے ہیں، اتنی تیزی کے ساتھ بڑھنے کے علاوہ بہترین لکڑی جو بالخصوص باریک تہوں کے کام آسکتی ہے، ان سے حاصل کی جاتی ہے۔

اسی صدی کا واقعہ ہے، ناگ پھنی کی ایک قسم آسٹریلیا میں کھیتوں کی باڑھ قائم کرنے کے لئے بوئی گئی آسٹریلیا میں اس ناگ پھنی کا کوئی دشمن کیڑا نہیں تھا، چنانچہ وہ بہت تیزی سے بڑھنا شروع ہو گئی، یہاں تک کہ انگلینڈ کے برابر رقبہ پر چھا گئی، وہ شہروں اور دیہاتوں میں آبادی کے اندر گھس گئی، کھیتوں کو ویران کر دیا اور زراعت کو ناممکن بنا دیا، کوئی تدبیر بھی اس کے خلاف کارگر ثابت نہیں ہوتی تھی، ناگ پھنی آسٹریلیا کے اوپر ایک ایسی فوج کی طرح مسلط تھی جس کا اس کے پاس کوئی توڑ نہیں تھا، بالآخر ماہرین حشرات الارض دنیا بھر میں اس کا علاج تلاش کرنے کے لئے نکلے، یہاں تک کہ ان کی رسائی ایک کیڑے تک ہوئی جو صرف ناگ پھنی کھا کر زندہ رہتا تھا، اس کے سوا اس کی کوئی خوراک نہیں تھی، وہ بہت تیزی سے اپنی نسل بڑھاتا تھا، اور آسٹریلیا میں اس کا کوئی دشمن نہیں تھا، اسی کیڑے نے آسٹریلیا میں ناگ پھنی کی ناقابل تسخیر فوج پر قابو پا لیا اور اب وہاں سے اس مصیبت کا خاتمہ ہو گیا۔

قدرت کے نظام میں یہ ضبط و توازن (Checks and Balances) کی عظیم تدبیریں کیا کسی شعوری منصوبے کے بغیر خود بخود وجود میں آجاتی ہیں؟

کائنات میں حیرت انگیز طور پر ریاضیاتی قطعیت پائی جاتی ہے، یہ جامد و بے شعور مادہ جو ہمارے سامنے ہے، اس کا عمل غیر منظم اور بے ترتیب نہیں بلکہ وہ متعین قوانین کا پابند ہے "پانی" کا لفظ خواہ دنیا کے جس خطہ میں اور جس وقت بھی بولا جائے اس کا ایک ہی مطلب ہوگا —— ایک ایسا مرکب جس میں ۱۱٫۱ فیصد ہائیڈروجن اور ۸۸٫۹ فیصد آکسیجن. ایک سائنس داں جب تجربہ گاہ میں داخل ہو کر پانی سے بھرے ہوئے ایک پیالے کو گرم کرتا ہے، تو وہ تھرمامیٹر کے بغیر یہ بتا سکتا ہے کہ پانی کا نقطۂ جوش ۱۰۰ درجہ سینٹی گریڈ ہے، جب تک ہوا کا دباؤ (Atmospheric Pressure) ۷۶۰ ایم ایم رہے، اگر ہوا کا دباؤ اس سے کم ہو تو اس حرارت کو وجود میں لانے کے لئے کم طاقت درکار ہوگی جو پانی کے سالمات کو توڑ کر بخارات کی شکل دیتی ہے، اس طرح نقطۂ جوش سو درجہ سے کم ہو جائے گا، اس کے برعکس اگر ہوا کا دباؤ ۷۶۰ ایم ایم سے زیادہ ہو تو نقطۂ جوش بھی اسی لحاظ سے زیادہ ہو جائے گا، یہ تجربہ اتنی بار آزمایا گیا ہے کہ اس کو یقینی طور پر پہلے سے بتایا جا سکتا ہے کہ پانی کا نقطۂ جوش کیا ہے، اگر مادہ اور توانائی کے عمل میں یہ نظم اور ضابطہ نہ ہوتا تو سائنسی تحقیقات اور ایجادات کے لئے کوئی بنیاد نہ ہوتی، کیونکہ پھر اس دنیا میں محض اتفاقات کی حکمرانی ہوتی اور علمائے طبیعیات کے لئے یہ بتانا ممکن نہ رہتا کہ فلاں حالت میں فلاں طریق عمل کے دہرانے سے فلاں نتیجہ پیدا ہوگا.

کیمیا کے میدان میں نو وارد طالب علم سب سے پہلے جس چیز کا مشاہدہ کرتا ہے، وہ عناصر میں نظم اور دوریت ہے، سو سال پہلے ایک روسی ماہر کیمیا منڈلیف (Mendeleev) نے جوہری قدر کے لحاظ سے مختلف کیمیائی عناصر کو ترتیب دیا تھا جس کو دوری نقشہ (Periodic Chart) کہا جاتا ہے، اس وقت تک موجودہ تمام عناصر دریافت نہیں ہوئے تھے، اس لئے اس کے نقشہ میں بہت سے عناصر کے خانے خالی تھے، جو

عین اندازے کے مطابق بعد کو پر ہو گئے، ان نقشوں میں سارے عناصر جوہری نمبروں کے تحت اپنے اپنے مخصوص گروپوں میں درج کئے جاتے ہیں، جوہری نمبر سے مراد ثبت برقیوں (Protons) کی وہ تعداد ہے جو ایٹم کے مرکز میں موجود ہوتی ہے، یہی تعداد ایک عنصر کے ایٹم اور دوسرے عنصر کے ایٹم میں فرق پیدا کر دیتی ہے، ہائیڈروجن جو سب سے سادہ عنصر ہے، اس کے ایٹم کے مرکز میں ایک پروٹون ہوتا ہے، ہیلیم میں دو اور لیتھیم میں تین، مختلف عناصر کی جدول تیار کرنا اسی لئے ممکن ہو سکا ہے کہ ان میں حیرت انگیز طور پر ایک ریاضیاتی اصول کارفرما ہے، نظم و ترتیب کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ عنصر نمبر ۱۰۱ کی شناخت محض اس کے ۱۷ پروٹونوں کے مطالعہ سے کر لی گئی، قدرت کی اس حیرت انگیز تنظیم کو ہم دوری اتفاق (Periodic Chance) نہیں کہتے، بلکہ اس کو دوری ضابطہ (Periodic Law) کہتے ہیں، مگر نقشہ اور ضابطہ جو یقینی طور پر ناظم اور منصوبہ ساز کا تقاضا کرتے ہیں، اس کا انکار کر دیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ جدید سائنس اگر خدا کو نہ مانے تو وہ خود اپنی تحقیق کے ایک لازمی نتیجے کا انکار کرے گی۔

"۱۱ راگست ۱۹۹۹ء میں ایک سورج گرہن واقع ہوگا جو کارنوال (Cornwall) میں مکمل طور پر دیکھا جا سکے گا" ——— یہ محض ایک قیاسی پیشین گوئی نہیں ہے بلکہ علمائے فلکیات یقین رکھتے ہیں کہ نظام شمسی کے موجودہ گردشی نظام کے تحت اس گہن کا پیش آنا یقینی ہے، جب ہم آسمان میں نظر ڈالتے ہیں تو ہم لاتعداد ستاروں کو ایک نظام میں منسلک دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں، ان گنت صدیوں سے اس فضائے بسیط میں جو عظیم گیندیں معلق ہیں، وہ ایک ہی معین راستے پر گردش کرتی چلی جا رہی ہیں، وہ اپنے مداروں میں اس نظم کے ساتھ آتی اور جاتی ہیں کہ ان کے جائے وقوع اور ان کے درمیان ہونے والے واقعات کا صدیوں پیشتر بالکل صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے، پانی کے ایک حقیر قطرے سے لے کر فضائے بسیط میں پھیلے ہوئے دور دراز ستاروں تک ایک فقید المثال نظم و ضبط پایا جاتا ہے، ان کے عمل میں اس درجہ یکسانیت ہے کہ ہم اس بنیاد پر قوانین مرتب کرتے ہیں۔

نیوٹن کا نظریہ کشش فلکیاتی کروں کی گردش کی توجیہہ کرتا ہے، اس کے نتیجے میں A.C. Adams اور لاویرے U. Leverrier کو وہ بنیاد ملی جس سے وہ دیکھے بغیر ایک ایسے سیارے کے وجود کی پیشین گوئی کر سکیں جو اس وقت تک نامعلوم تھا چنانچہ ستمبر ۱۸۴۶ء کی ایک رات کو جب برلن آبزرویٹری کی دوربین کا رخ آسمان میں ان کے بتائے ہوئے مقام کی طرف کیا گیا تو فی الواقع نظر آیا کہ ایسا ایک سیارہ نظام شمسی میں موجود ہے، جس کو ہم اب نیپچوں (Neptune) کے نام سے جانتے ہیں۔

کس قدر ناقابل قیاس بات ہے کہ کائنات میں یہ ریاضیاتی قطعیت خود بخود قائم ہو گئی ہو۔

کائنات کی حکمت و معنویت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے اندر ایسے امکانات رکھے گئے ہیں کہ انسان بوقت ضرورت تصرف کر کے اس کو اپنے لئے استعمال کر سکے، مثال کے طور پر نائٹروجن کے مسئلہ کو لیجئے، ہوا کے ہر جھونکے میں نائٹروجن ۸۰ فی صد ہوتا ہے، اس کے علاوہ بہت سے کیمیائی اجزا ہیں، جن میں نائٹروجن شامل ہوتا ہے، ان کو ہم مرکب نائٹروجن کہہ سکتے ہیں، یہی وہ نائٹروجن ہے جس کو پودے استعمال کرتے ہیں، اور جن سے ہماری غذا کا نائٹروجنی حصہ تیار ہوتا ہے، اگر یہ نہ ہو تو انسان اور جانور بھوکوں مر جائیں۔

صرف دو طریقے ہیں، جن سے قابل تحلیل نائٹروجن مٹی میں مل کر کھاد بنتا ہے، اگر یہ نائٹروجن مٹی میں شامل نہ ہو تو کوئی بھی غذائی پودا نہ اُگے، ایک طریقہ جس سے یہ نائٹروجن مٹی میں شامل ہوتا ہے وہ مخصوص بیکٹیریائی عمل ہے، یہ بیکٹیریا دال کے پودوں کی جڑوں میں رہتے ہیں، اور ہوا سے نائٹروجن لے کر اس کو مرکب نائٹروجن کی شکل دیتے رہتے ہیں، پودا جب سوکھ کر ختم ہو جاتا ہے تو اس مرکب نائٹروجن کا کچھ حصہ زمین میں رہ جاتا ہے۔

دوسرا ذریعہ جس سے مٹی کو نائٹروجن ملتا ہے، وہ بجلی کا کڑکا ہے، ہر بار جب بجلی کی رو فضا میں گزرتی ہے تو وہ تھوڑے سے آکسیجن کو نائٹروجن کے ساتھ مرکب کر دیتی ہے جو کہ بارش کے ذریعہ ہمارے کھیتوں میں پہنچ جاتا ہے، اس طرح سے جو نائٹریٹ نائٹروجن آسانی سے مل جاتا ہے، اس کا اندازہ سالانہ ایک ایکڑ زمین میں پانچ پونڈ ہے جو کہ تیس پونڈ سوڈیم نائٹریٹ کے برابر ہے[1]۔

---

[1] Lyon, Bockman and Brady *The Nature and Properties of Soils*

یہ دونوں طریقے بہر حال ناکافی تھے' اور یہی وجہ ہے کہ وہ کھیت جن میں عرصہ دراز تک کھیتی ہوتی رہتی ہے' ان کا نائٹروجن ختم ہو جاتا ہے' اور اسی لئے کاشتکار فصلوں کا الٹ پھیر کرتے رہتے ہیں' یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ ایک ایسے مرحلے میں جبکہ اضافہ آبادی اور کثرت کاشت کی وجہ سے مرکب نائٹروجن کی کمی محسوس کی جانے لگی تھی' اور انسان کو مستقبل میں قحط کے آثار نظر آنے لگے تھے، اور یہ صرف اس صدی کے آغاز کی بات ہے کہ عین اس وقت وہ طریقہ دریافت ہو گیا جس سے ہوا کے ذریعہ مصنوعی طور پر مرکب نائٹروجن بنایا جاسکتا ہے' مرکب نائٹروجن بنانے کے لئے جو کوششیں کی گئیں' ان میں سے ایک یہ تھی' کہ فضا میں مصنوعی طور پر بجلی کا کڑکا پیدا کیا گیا، کہا جاتا ہے کہ ہوا میں بجلی کی چمک پیدا کرنے کے لئے تقریباً تین لاکھ ہارس پاور کی قوت استعمال کی گئی' اور جیسا کہ پہلے سے اندازہ کیا جا چکا تھا، ایک قلیل مقدار نائٹروجن کی تیار ہو گئی، مگر اب انسان کی خداداد عقل نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور انسانی تاریخ کے دس ہزار سال بعد ایسے طریقے معلوم کر لئے گئے ہیں' جن سے وہ اس گیس کو کھاد میں تبدیل کر سکتا ہے' اس کے بعد انسان اس قابل ہو گیا ہے کہ وہ اپنی غذا کے اس لازمی جزو کو تیار کر سکے جس کے بغیر وہ بھوکوں مر جاتا، یہ نہایت عجیب حسن اتفاق ہے کہ زمین کی تاریخ میں پہلی بار عین وقت پر انسان نے قلت خوراک کا حل دریافت کر لیا، یہ المیہ ٹھیک اس وقت رفع ہو گیا جب کہ اس کے واقع ہونے کا امکان تھا۔

کائنات میں اس طرح کی حکمت و معنویت کے بے شمار پہلو ہیں' ہماری تمام سائنسوں نے ہم کو صرف یہ بتایا ہے کہ جو کچھ ہم نے معلوم کیا ہے، اس سے بہت زیادہ ہے وہ چیز جس کو معلوم کرنا ابھی باقی ہے' تاہم جو کچھ انسان معلوم کر چکا ہے' وہ بھی اتنا زیادہ ہے کہ اس کے صرف عنوانات کی فہرست دینے کے لئے موجودہ کتاب سے بہت زیادہ ضخیم کتاب کی ضرورت ہو گی' اور پھر بھی کچھ عنوانات بچ رہیں گے، انسان کی زبان سے آلاءِ رب اور آیاتِ الٰہی کا ہر اظہار ناقص اظہار ہے' اس کی جتنی بھی تفصیل کی جائے، جہاں زبان و قلم رکیں گے وہاں یہ احساس ضرور موجود ہو گا کہ ہم نے "بیان" نہیں کیا بلکہ اس کی "تحدید" کر دی' حقیقت یہ ہے کہ اگر

سارے علوم منکشف ہو جائیں، اور اس کے بعد سارے انسان اس طرح لکھنے بیٹھ جائیں کہ دنیا کے تمام وسائل ان کے لئے مساعد ہوں، جب بھی کائنات کی حکمتوں کا بیان مکمل نہیں ہو سکتا۔

وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِن شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ	اگر زمین کے تمام درخت قلم ہوں اور موجودہ سمندر
وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِن بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ	کے ساتھ سات اور سمندر ان کی سیاہی کا کام
مَّا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ ۔ (لقمان ـ ٢٧)	دیں، جب بھی خدا کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔

جس نے بھی کائنات کا کچھ مطالعہ کیا ہے، وہ بلاشبہ اعتراف کرے گا کہ کتاب الٰہی کے ان الفاظ میں ذرا بھی مبالغہ نہیں، وہ صرف ایک موجودہ حقیقت کا سادہ سا اظہار ہے۔

پچھلے صفحات میں کائنات کے حیرت انگیز نظم اور اس کے اندر غیر معمولی حکمت و معنویت کا جو حوالہ دیا گیا ہے، مخالفین مذہب اس کو بطور واقعہ تسلیم کرتے ہوئے اس کی دوسری توجیہ کرتے ہیں اس میں انھیں کسی ناظم و مدبر کا اشارہ نہیں ملتا، بلکہ یہ سب کچھ ان کے نزدیک محض "اتفاق" سے ہو گیا ہے، ٹی۔ ایچ ہکسلے کے الفاظ میں چھ بندر اگر ٹائپ رائٹر پر بیٹھ جائیں اور کروروں سال تک اسے پیٹتے رہیں تو ہو سکتا ہے کہ ان کے سیاہ کئے ہوئے کاغذات کے ڈھیر میں سے آخری کاغذ پر شیکسپیر کی ایک نظم (Sonnet) نکل آئے، اسی طرح اربوں اور کھربوں سال مادہ کے اندھادھند گردش کے دوران میں موجودہ کائنات بن گئی ہے۔

The Mysterious Universe, p.3-4

یہ بات اگرچہ بجائے خود بالکل لغو ہے، کیونکہ ہمارے آج تک کے تمام علوم ایسے کسی اتفاق سے قطعاً ناواقف ہیں جس کے نتیجہ میں اتنا عظیم، اس قدر بامعنی اور مستقل واقعہ وجود میں آجائے جیسی کہ یہ کائنات ہے، بلاشبہ ہم بعض اتفاقات سے واقف ہیں، مثلاً ہوا کا جھونکا کبھی سرخ گلاب کے زیرہ (Pollen) کو اڑا کر سفید گلاب پر ڈال دیتا ہے جس کے نتیجے میں زرد رنگ کا پھول کھلتا ہے، مگر اس قسم کا اتفاق صرف ایک جزوی اور استثنائی واقعہ کی توجیہ کرتا ہے، گلاب کا پورا وجود، کائنات کے اندر ایک حالت میں اس کی مسلسل موجودگی

اور سارے نظام عالم سے اس کا حیرت انگیز ربط ہوا کے اتفاقی جھونکے سے سمجھا نہیں جا سکتا" اتفاقی واقعہ" کے لفظ میں ایک جزوی صداقت ہونے کے باوجود کائنات کی توجیہ کے اعتبار سے وہ ایک لغو بات ہے، پروفیسر ایڈون (Edwin Conklin) کے الفاظ میں" زندگی کا بذریعہ حادثہ (Accident) وقوع میں آجانا ایسا ہی ہے جیسے کسی پریس میں دھماکہ ہوجانے سے ایک ضخیم لغت کا تیار ہوجانا"۔

The Evidence of God, p.174

کہا جاتا ہے کہ" اتفاق" کے حوالے سے کائنات کی توجیہ کوئی الل ٹپ بات نہیں ہے، بلکہ سرجیمز کے الفاظ میں وہ خالص ریاضیاتی قوانین اتفاق (Purely Mathematical Laws of Chance) پر مبنی ہے[1]۔ ایک مصنف لکھتا ہے:-

"اتفاق" (Chance) محض ایک فرضی چیز نہیں ہے بلکہ ایک بہت ہی ترقی یافتہ حسابی نظریہ ہے جس کا اطلاق ان امور پر کیا جاتا ہے جن میں قطعی معلومات ممکن نہیں ہوتیں، اس نظریے کے ذریعہ ایسے بے لاگ اصول ہمارے ہاتھ آجاتے ہیں جن کی مدد سے ہم صحیح اور غلط میں بآسانی امتیاز کر سکتے ہیں، اور کسی خاص نوعیت کے واقعہ کے صادر ہونے کے امکانات کا حساب لگا کر صحیح صحیح اندازہ کر سکتے ہیں کہ اتفاقاً اس کا پیش آجانا کس حد تک ممکن ہے[2]۔"

اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ مادہ کسی خام حالت میں خود سے کائنات میں موجود ہو گیا، اور پھر یہ بھی فرض کرلیں کہ اس میں عمل اور رد عمل کا ایک سلسلہ بھی اپنے آپ شروع ہو گیا، اگرچہ ان مفروضات کے لئے کوئی بنیاد نہیں ہے ـــــ جب بھی کائنات کی توجیہ حاصل نہیں ہوتی، کیونکہ یہاں ایک اور اتفاق مخالفین مذہب کی راہ میں حائل ہو گیا ہے، بدقسمتی سے ہماری ریاضیات جو قانونِ اتفاق کا قیمتی نکتہ ہمیں دیتی ہے، وہی اس بات کی تردید بھی کر رہی ہے کہ قانون اتفاق' موجودہ کائنات کا خالق ہو سکتا ہے، کیونکہ سائنس نے معلوم کرلیا ہے کہ

---

1. *The Mysterious Universe*, p.3
2. *The Evidence of God*, p.23

ہماری دنیا کی عمر اور جسامت کیا ہے، اور جو عمر اور جسامت اس نے معلوم کی ہے، وہ قانون اتفاق کے تحت موجودہ دنیا کے وقوع میں آنے کے لئے بالکل ناکافی ہے۔

"اگر تم دس سکے لو اور ان پر ایک سے دس تک نشان لگا دو، اس کے بعد انھیں اپنی جیب میں ڈال کر اچھی طرح ملا دو، اب ان کو ایک سے دس تک بالترتیب اس طرح نکالنے کی کوشش کرو کہ ایک سکہ کو نکالنے کے بعد ہر بار اس کو دوبارہ جیب میں ڈال دو ــــ یہ امکان کہ نمبر ایک کا سکہ پہلی بار تمھارے ہاتھ میں آجائے دس میں ایک ہے، یہ امکان کہ ایک اور دو بالترتیب تمھارے ہاتھ میں آجائیں سو میں ایک ہے، یہ امکان کہ ایک، دو اور تین نمبر سلسلہ وار تمھارے ہاتھ میں آجائیں ایک ہزار میں ایک ہے، یہ امکان کہ ایک، دو، تین اور چار نمبر کے سکے بالترتیب نکل آئیں دس ہزار میں ایک ہے، یہاں تک کہ یہ امکان کہ ایک سے دس تک تمام سکے بالترتیب تمھارے ہاتھ میں آجائیں دس بلین (دس ارب) میں صرف ایک بار ہے۔"

یہ مثال نقل کرنے کے بعد کریسی مارلین (A. Cressy Morrison) لکھتا ہے:۔

> "The object in dealing with so simple a problem is to show how enormously figures multiply against chance."
> *Man does not Stand Alone*, p.17

یعنی یہ سادہ مثال اس لئے دی گئی تاکہ یہ امر اچھی طرح واضح ہو جائے کہ واقعات کی تعداد کی نسبت سے امکانات کی تعداد کتنی زیادہ ہوتی ہے۔

اب اندازہ کیجئے کہ اگر سب کچھ محض اتفاق سے ہوگیا ہے، تو اس کے لئے کتنی مدت درکار ہوگی، ذی حیات اشیاء کی ترکیب زندہ خلیوں (Living Cells) سے ہوتی ہے، خلیہ ایک نہایت چھوٹا اور پیچیدہ مرکب ہے جس کا مطالعہ علم الخلیہ (Cytology) میں کیا جاتا ہے، ان خلیوں کی تعمیر میں جو اجزاء کام آتے ہیں، ان میں سے ایک پروٹین ہے، پروٹین ایک کیمیائی مرکب ہے جو پانچ عناصر کے ملنے سے وجود میں آتا ہے ــــ کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، آکسیجن اور گندھک پروٹینی سالمہ ان عناصر کے تقریباً چالیس ہزار

جواہر (Atoms) پر مشتمل ہوتا ہے۔

کائنات میں سو سے زیادہ کیمیائی عناصر بالکل منتشر اور بے ترتیب بکھرے ہوئے ہیں، اب اس امر کا امکان کس حد تک ہے کہ ان تمام عناصر کے بے ترتیب ڈھیر میں سے نکل کر یہ پانچوں عناصر اس طرح باہم ملیں کہ ایک پروٹینی سالمہ آپ سے آپ وجود میں آجائے، مادے کی وہ مقدار جسے مسلسل ہلانے سے اتفاقاً یہ نتیجہ نکل سکتا ہو اور وہ مدت جس کے اندر اس کام کی تکمیل ممکن ہو، حساب لگا کر معلوم کی جا سکتی ہے۔

سوئٹزرلینڈ کے ایک ریاضی داں پروفیسر چارلس ایوجین گائی (Charles Eugene Guye) نے اس کا حساب لگایا ہے اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ اس طرح کے کسی اتفاقی واقعہ کا امکان 10^{160} کے مقابلے میں صرف ایک درجہ ہو سکتا ہے، 10^{160} کا مطلب یہ ہے کہ دس کو دس سے ایک سو ساٹھ مرتبہ پے در پے ضرب دیا جائے، دوسرے لفظوں میں دس کے آگے ایک سو ساٹھ صفر ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا عدد ہے جس کو الفاظ کی زبان میں ظاہر کرنا مشکل ہے۔

صرف ایک پروٹینی سالمہ کے اتفاقاً وجود میں آنے کے لئے پوری کائنات کے موجودہ مادہ سے کروڑوں گنا زیادہ مقدار مادہ مطلوب ہوگی جسے یکجا کر کے ہلایا جائے، اور اس عمل سے کوئی نتیجہ برآمد ہونے کا امکان 10^{243} سال بعد ہے۔

پروٹین امینو ایسڈ (Amino Acids) کے لمبے سلسلوں سے وجود میں آتے ہیں، اس میں سب سے زیادہ اہمیت اس طریقہ کی ہے، جس سے یہ سلسلے باہم ملیں، اگر یہ غلط شکل میں یکجا ہو جائیں تو زندگی کی بقا کا ذریعہ بننے کے بجائے مہلک زہر بن جاتے ہیں، پروفیسر جے۔ بی لیتھیز (J.B. Leathes) نے حساب لگایا ہے کہ ایک سادہ سے پروٹین کے سلسلوں کو اربوں اور کھربوں 10^{48} طریقے سے یکجا کیا جا سکتا ہے، یہ ناممکن ہے کہ یہ تمام امکانات ایک پروٹینی سالمہ کو وجود میں لانے کے لئے محض اتفاق سے یکجا ہو جائیں۔

واضح ہو کہ اس انتہائی بعید امکان کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ بے شمار مدت کی تکرار کے بعد لازماً یہ

واقعہ ظہور میں آجائے گا، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ممکن ہے ایسا ہو جائے، دوسری طرف یہ امکان بھی ہے کہ ہمیشہ دہراتے رہنے کے باوجود کبھی بھی ایسا کوئی واقعہ ظہور میں نہ آئے۔

پھر پروٹین خود محض ایک کیمیائی شے ہے، جس میں زندگی موجود نہیں ہوتی، پروٹین کے خلیہ کا جز بننے کے بعد اس میں زندگی کی حرارت کیسے پیدا ہوئی، اس کا جواب اس توجیہہ میں نہیں ہے، پھر یہ بھی خلیہ کے صرف ایک ترکیبی جزو پروٹین ـــــ کے صرف ایک ناقابل مشاہدہ ذرہ کے وجود میں آنے کی توجیہہ ہے، جب کہ صرف ایک ذی حیات جسم کے اندر سنکھ مہا سنکھ کی تعداد میں ایسے مرکبات ہوتے ہیں۔

لے کامٹے ڈو نوائے (Le Comte Du Nouy) نے اس پر بہت عمدہ اور مفصل بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس طرح کے امکان کے ظہور میں آنے کے لئے جس وقت، جس مقدار مادہ اور جس پہنائی کی ضرورت ہوگی وہ ہمارے تمام اندازوں سے ناقابل یقین حد تک زیادہ ہے، اس کے لئے ایک ایسے عالم کی ضرورت ہے جس کا دائرہ اتنا بڑا ہو جس میں روشنی 10^{82} سال نور (دس کے آگے ۸۲ صفر) سفر کر کے اس کو پار کر سکتی ہو، یہ حجم موجودہ کائنات سے بہت زیادہ ہے، کیونکہ ہماری بعید ترین کہکشاں کی روشنی چند بلین سال نور میں ہم تک پہنچ جاتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ آئن سٹائن نے کائنات کی وسعت کا جو اندازہ کیا ہے، وہ اس عمل کے لئے قطعاً ناکافی ہے، پھر اس مفروضہ کائنات میں پانچ سو ٹریلین حرکت فی سکنڈ کی رفتار سے مادہ کی مفروضہ مقدار کو ہلایا جائے تب کہیں اس امر کا امکان پیدا ہوگا کہ پروٹین کا ایک ایسا سالمہ اتفاق سے وجود میں آئے جو زندگی کے لئے ضروری اور مفید ہے، اور اس سارے عمل کے لئے جس مدت کی ضرورت ہے وہ 10^{243} (دس کے آگے ۲۴۳ صفر) بلین سال ہے، مگر ہمیں بھولنا نہیں چاہئے" ڈو نوائے لکھتا ہے "کہ زمین صرف دو بلین سال سے موجود ہے اور یہ کہ زندگی کی ابتدا صرف ایک بلین سال پہلے ہوئی جبکہ زمین ٹھنڈی ہوئی"۔

Human Destiny, p.30-36

سائنس نے اگرچہ ساری کائنات کی عمر دریافت کرنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ موجودہ کائنات پچاس کھرب سال سے موجود ہے، ظاہر ہے کہ یہ طویل عمر بھی ایک مطلوبہ پروٹینی سالمہ کو اتفاقاً وجود میں لانے کے لئے ناکافی ہے، مگر جہاں تک زمین کا تعلق ہے جس پر ہماری معلوم زندگی پیدا ہوئی اس کی عمر تو نہایت قطعیت کے ساتھ معلوم کر لی گئی ہے۔

ماہرین فلکیات کے اندازے کے مطابق زمین سورج کا ایک ٹکڑا ہے، جو کسی بڑے ستارے کی کشش سے ٹوٹ کر فضا میں گردش کرنے لگا تھا، اس وقت زمین سورج کی مانند ایک مجسم شعلہ تھی، جس میں کسی بھی قسم کی زندگی پیدا ہونے کا کوئی سوال نہیں تھا، اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہو کر منجمد ہوئی، اس انجماد ہی کے بعد یہ امکان پیدا ہوتا ہے کہ اس میں زندگی کا آغاز ہو۔

زمین کی عمر جب سے کہ وہ ٹھوس ہوئی مختلف طریقوں سے نہایت صحیح طور پر معلوم کی جا سکتی ہے ان میں سب سے عمدہ طریقہ تابکار عناصر (Radio-Active Elements) کے ذریعہ معلوم ہوا ہے، تابکار عناصر کے ایٹم کے برقی ذرات ایک خاص تناسب سے مسلسل خارج ہوتے رہتے ہیں' اور اسی لئے وہ ہم کو روشن نظر آتے ہیں' اس اخراج یا انتشار کی وجہ سے ان کے برقی ذرات کی تعداد گھٹتی رہتی ہے' اور وہ دھیرے دھیرے غیر تابکار دھات میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں، یورینیم اسی قسم کا ایک تابکار عنصر ہے۔ وہ عمل انتشار کی وجہ سے ایک خاص اور متعین شرح سے سیسہ میں تبدیل ہوتا رہتا ہے، یہ پایا گیا ہے کہ اس تبدیلی کی شرح کسی بھی سخت ترین حرارت یا دباؤ سے متاثر نہیں ہوتی، ہم تبدیلی کی اس رفتار کو اٹل سمجھنے میں حق بجانب ہیں، یورینیم کے ٹکڑے مختلف چٹانوں میں پائے جاتے ہیں' اور بلاشبہ وہ اس وقت سے چٹان کا جزو ہیں' جبکہ یہ چٹان منجمد ہوئی یورینیم کے ساتھ ہم سیسہ پاتے ہیں' ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ تمام سیسہ جو یورینیم کے ساتھ پایا جاتا ہے' وہ یورینیم کے انتشا (Disintegration of Uranium) سے وجود میں آیا ہے، کیونکہ یورینیم سے بنا ہوا سیسہ' عام سیسے سے کچھ ہلکا ہوتا ہے، اس لئے سیسہ کے کسی بھی ٹکڑے کے بارے میں یہ کہنا ممکن ہے کہ وہ یورینیم سے

بنا ہے یا نہیں، اس سے ہم حساب لگا سکتے ہیں کہ یورینیم جس چٹان میں ہے وہاں کتنی مدت سے اس پر انتشار کا عمل ہو رہا ہے، اور چونکہ یورینیم چٹان میں اس وقت سے ہے، جب کہ وہ چٹان منجمد ہوئی، اس لئے ہم اس کے ذریعے سے خود چٹان کے انجماد کی مدت معلوم کر سکتے ہیں۔

اس طرح کے اندازے بتاتے ہیں کہ چٹان کے انجماد کو کم از کم چودہ سو ملین سال گزر چکے ہیں، یہ اندازے ان چٹانوں کے مطالعہ پر مبنی ہیں جو ہمارے علم کے مطابق زمین کی قدیم ترین چٹانیں ہیں، کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے زمین کی عمر اس سے بہت زیادہ مثلاً دگنا اور تگنا ہو، مگر ارضیاتی مشاہدہ کے دوسرے شواہد اس طرح کے غیر معمولی اندازوں کی تردید کرتے ہیں، چنانچہ جے، ڈبلیو، این، سولیون نے زمین کی عمر کا ایک بہتر اوسط دو ہزار ملین سال قرار دیا ہے[1]، اب ظاہر ہے کہ جب صرف ایک غیر ذی روح پروٹینی سالمہ کے مرکب کو اتفاقاً وجود میں لانے کے لئے سنکھ مہا سنکھ سے بھی زیادہ مدت درکار ہے تو صرف دو ہزار ملین سال میں زمین کی سطح پر زندہ اور مکمل اجسام رکھنے والے حیوانات کی دس لاکھ سے زیادہ اور نباتات کی دو لاکھ سے زیادہ اقسام کیسے وجود میں آگئیں اور ہر قسم میں لاتعداد حیوانات و نباتات پیدا ہو کر خشکی اور تری میں کیسے پھیل گئے، اور پھر انھیں ادنیٰ درجہ کی ذی روح اشیا سے اتنی قلیل مدت میں انسان جیسی اعلیٰ مخلوق اتفاقاً کیسے وجود میں آگئی جب کہ نظریۂ ارتقاء انواع میں جن اتفاقی تبدیلیوں کے اوپر اپنی بنیاد کھڑی کرتا ہے، ان میں سے ہر تبدیلی کا حال یہ ہے کہ ماہر ریاضی پاچو (Patau) نے حساب لگایا ہے کہ کسی ذی حیات میں نئی تبدیلی کو مکمل ہوتے ہوتے دس لاکھ پشتوں کے گزر جانے کا امکان ہے[2]، اس سے اندازہ کیجیے کہ اگر محض ارتقاء کے اندھے مادی عمل کے ذریعہ کتے کی طرح پانچ انگلیاں رکھنے والے جد امجد کی نسل میں بے شمار تبدیلیوں کے جمع ہونے سے گھوڑے جیسا مختلف جانور بن گیا ہے، تو اس کے بننے میں کتنا عرصہ درکار ہوگا۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امریکی عالم عضویات ایم۔ بی۔ کریڈر Martin Broks Kreider

---

[1] Limitations of Science, p.78 [2] The Evidence of God, p.117

کے الفاظ کس قدر صحیح ہیں۔

"The mathematical probability of a chance occurrence of all the necessary factors in the right proportion is almost nil.

The Evidence of God, p.67

یعنی تخلیق کے تمام ضروری اسباب کا صحیح تناسب کے ساتھ اتفاقاً اکٹھا ہو جانے کا امکان ریاضیاتی طور پر قریب قریب نفی کے برابر ہے۔

یہ طویل تجزیہ محض اتفاقی پیدائش کے نظریے کی لغویت واضح کرنے کے لئے کیا گیا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ "اتفاق" سے نہ کوئی ایٹم یا مالے کیول وجود میں آسکتا ہے، اور نہ وہ ذہن پیدا ہو سکتا ہے، جو یہ سوچ رہا ہے کہ کائنات کیسے وجود میں آئی، خواہ اس کے لئے کتنی ہی طویل مدت فرض کی جائے، یہ نظریہ نہ صرف ریاضیاتی طور پر محال ہے، بلکہ منطقی حیثیت سے بھی وہ اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتا، یہ ایسی ہی لغوبات ہے، جیسے کوئی کہے کہ ایک گلاس پانی فرش پر گرنے سے دنیا کا نقشہ مرتب ہو سکتا ہے، ایسے شخص سے بجا طور پر پوچھا جاسکتا ہے کہ اس اتفاق کے پیش آنے کے لئے فرش، کشش ارضی، پانی اور گلاس کہاں سے وجود میں آگئے۔

علم حیاتیات کا مشہور عالم ہیکل (Haeckel) نے کہا تھا "مجھے ہوا، پانی، کیمیائی اجزاء اور وقت دو، میں ایک انسان بنا دوں گا" مگر یہ کہتے ہوئے وہ بھول گیا کہ اس اتفاق کو وجود میں لانے کے لئے ایک ہیکل اور مادی حالات کی موجودگی کو ضروری قرار دے کر وہ خود اپنے دعوے کی تردید کر رہا ہے، بہت خوب کہا ہے مارلیسن نے:

"ہیکل نے یہ کہتے ہوئے جین اور خود زندگی کے مسئلہ کو نظر انداز کر دیا، انسان کو وجود میں لانے کے لئے اس کو سب سے پہلے ناقابل مشاہدہ ایٹم فراہم کرنے ہوں گے، پھر ان کو مخصوص ڈھنگ سے ترتیب دے کر جین بنانا ہوگا، اور اس کو زندگی دینی ہوگی، پھر بھی اس کی اس اتفاقی تخلیق کا امکان

کروڑوں میں ایک کا ہے، اور بالفرض اگر وہ کامیاب بھی ہو جائے تو اس کو وہ اتفاق (Accident) نہیں کہہ سکتا بلکہ وہ اس کو اپنی ذہانت (Intelligence) کا ایک نتیجہ قرار دے گا۔"

Man does not Stand Alone, p.87

اس بحث کو میں ایک امریکی عالم طبیعیات جارج ارل ڈیوس (Earl Davis) کے الفاظ پر ختم کروں گا

"اگر کائنات خود اپنے آپ کو پیدا کر سکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے اندر خالق کے اوصاف رکھتی ہے، ایسی صورت میں ہم یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ کائنات خود خدا ہے، اس طرح اگرچہ ہم خدا کے وجود کو تو تسلیم کر لیں گے، لیکن وہ نرالا خدا ہوگا جو بیک وقت مافوق الفطرت بھی ہوگا اور مادی بھی، میں اس طرح کے کسی مہمل تصور کو اپنانے کے بجائے ایک ایسے خدا پر عقیدے کو ترجیح دیتا ہوں جس نے عالم مادی کی تخلیق کی ہے، اور اس عالم کا وہ خود کوئی جز و نہیں، بلکہ اس کا فرمانروا اور ناظم و مدبر ہے۔"

The Evidence of God, p.71

دلیلِ آخرت

مذہب جن حقیقتوں کو ماننے کی ہمیں دعوت دیتا ہے، ان میں سے ایک اہم ترین حقیقت ـــــ آخرت کا تصور ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا کے بعد ایک اور دنیا ہے، جہاں ہم کو ہمیشہ رہنا ہے، موجودہ دنیا انسان کی امتحان گاہ ہے، یہاں ایک خاص عرصہ کے لئے انسان کو رکھا گیا ہے، اس کے بعد ایک وقت ایسا آنے والا ہے، جب اس کا مالک اسے توڑ کر دوسری دنیا دوسرے ڈھنگ پر بنائے گا، وہاں تمام انسان دوبارہ زندہ کئے جائیں گے، ہر ایک نے موجودہ دنیا میں جو اچھے یا برے عمل کئے ہیں، وہ تمام وہاں خدا کی عدالت میں پیش ہوں گے، اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق انعام یا سزا دی جائے گی۔

یہ نظریہ صحیح ہے یا غلط، اس کو جانچنے کے لئے ہم اس پر چند پہلوؤں سے غور کریں گے۔

امکان

پہلی بات یہ ہے کہ کائنات کے موجودہ نظام میں کیا اس طرح کی کسی آخرت کا واقع ہونا ممکن نظر آتا ہے کیا یہاں کچھ ایسے واقعات اور اشارے پائے جاتے ہیں، جو اس دعوے کی تصدیق کر رہے ہوں۔

یہ نظریہ سب سے پہلے یہ چاہتا ہے کہ انسان اور کائنات اپنی موجودہ شکل میں ابدی نہ ہوں، اور یہ دونوں چیزیں ہماری اب تک کی معلومات کے مطابق بالکل یقینی ہیں، ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہاں

انسان کے لئے بھی موت ہے اور کائنات کے لئے بھی موت، دونوں میں سے کوئی بھی موت کے خطرے سے خالی نہیں

جو لوگ دوسری دنیا کو نہیں مانتے وہ قدرتی طور پر یہ چاہتے ہیں کہ اسی دنیا کو اپنی ابدی خوشیوں کی دنیا بنائیں، انھوں نے اس بات کی بہت تحقیق کی کہ موت کیوں آتی ہے تاکہ اس کے اسباب کو روک کر زندگی کو جاوداں بنایا جاسکے، مگر انھیں اس سلسلے میں قطعی ناکامی ہوئی ___ ہر مطالعہ نے بالآخر یہی بتایا کہ موت یقینی ہے، اس سے چھٹکارا نہیں۔

"موت کیوں آتی ہے" ___ اس کے تقریباً دو سو جوابات دیے گئے ہیں، جسم ناکارہ ہوجاتا ہے، اجزائے ترکیبی صرف ہوچکتے ہیں، رگیں پتھرا جاتی ہیں، متحرک البومن کی جگہ کم متحرک البومن آجاتے ہیں، مربوط کرنے والے نسیج بیکار ہوجاتے ہیں، جسم میں آنتوں کے بیکٹیریا کا زہر دوڑ جاتا ہے ...... وغیرہ وغیرہ

جسم کے ناکارہ ہونے کی بات بظاہر درست معلوم ہوتی ہے، کیونکہ مشینیں، جوتے، کپڑے، سبھی ایک خاص مدت کے بعد ناکارہ ہوجاتے ہیں، اس لئے ہوسکتا ہے کہ پوستین کی طرح ہمارا جسم بھی، جلد یا بدیر پرانا ہوکر ختم ہوجاتا ہو، مگر سائنس اس کی تائید نہیں کرتی، سائنسی تشریح کے مطابق جسم انسانی نہ پوستین کی طرح ہوتا ہے، نہ مشین سے ملتا جلتا ہے، اور نہ چٹان سے مشابہ ہے، اگر اسے تشبیہ دی جاسکتی ہے، تو دریا سے جو ہزار سال پہلے بھی بہا کرتا تھا، اور آج بھی اسی طرح بہہ رہا ہے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ دریا پرانا ہوتا ہے یا ناکارہ ہوجاتا ہے، اسی بنیاد پر کیمسٹری کے نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر لنس پالنگ نے کہا ہے کہ نظریاتی طور پر انسان بڑی حد تک لافانی ہے، اس کے جسم کے خلیے ایسی مشین ہیں، جو خود بخود اپنی خرابی دور کرلیتے ہیں، لیکن اس کے باوجود انسان بوڑھا ہوتا ہے اور مرجاتا ہے ___ اس کے اسباب ابھی تک راز بنے ہوئے ہیں۔

ہماری زندگی کی مسلسل تجدید ہوتی رہتی ہے، ہمارے خلیوں میں البومن کے سالمے بنتے اور تلف ہوتے اور پھر بنتے رہتے ہیں، خلیے بھی (سوائے اعصابی خلیوں کے) برابر تلف ہوتے اور ان کی جگہ نئے بنتے رہتے ہیں، اندازہ لگایا گیا ہے، کہ کوئی چار مہینے کے عرصے میں انسان کا خون بالکل ہی نیا ہوجاتا ہے، اور

چند سال کے عرصے میں انسانی جسم کے تمام ایٹم پوری طرح بدل جاتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی نوعیت ایک ڈھانچے کی نہیں بلکہ دریا کی سی ہے، یعنی وہ ایک عمل ہے، ایسی حالت میں جسم کے پرانے اور ناکارہ ہونے کے تمام نظریے بے بنیاد ہو جاتے ہیں، وہ تمام چیزیں جو زندگی کے ابتدائی برسوں میں خراب ہو گئی تھیں، زہر آلود اور بیکار ہو چکی تھیں، وہ جسم سے کب کی خارج ہو چکیں، پھر ان کو موت کا سبب قرار دینا کیا معنی ـــــ اس کا مطلب یہ ہوا کہ موت کا سبب آنتوں اور رگوں اور دل میں نہیں، بلکہ اس کا سبب کہیں اور ہے۔

ایک توجیہہ یہ ہے کہ اعصابی خلیے موت کا سبب ہیں، کیونکہ اعصابی خلیے زندگی بھر وہی رہتے ہیں یہ کبھی نہیں بدلتے، چنانچہ انسان کے اندر اعصابی خلیے سال بہ سال کم ہوتے جاتے ہیں، اور مجموعی طور پر اعصابی نظام کمزور ہوتا جاتا ہے، اگر یہ توجیہہ صحیح ہے، اور اعصابی نظام ہی نظام جسمانی کا کمزور حصہ ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ نظام جسمانی سب سے زیادہ دنوں تک زندہ رہنا چاہیے، جن میں اعصابی نظام ہوتا ہی نہیں۔

مگر مشاہدہ اس کی تائید نہیں کرتا، درخت میں اعصابی نظام نہیں ہوتا اور وہ سب سے زیادہ دنوں تک زندہ رہتا ہے، مگر گیہوں میں بھی اعصاب نہیں ہوتے مگر وہ صرف سال بھر زندہ رہتا ہے، اور اسی طرح ایما کیڑے میں بھی اعصاب نہیں ہوتے لیکن وہ صرف آدھ گھنٹہ زندہ رہتا ہے، اسی طرح اس توجیہہ کا مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ نسل کے حیوانات کی عمر، جن کا اعصابی نظام مکمل ترین ہوتا ہے، سب سے زیادہ ہونی چاہیے، مگر ایسا نہیں ہے، مگرمچھ، کچھوا اور پائک مچھلی سب سے لمبی عمر پاتے ہیں۔

اس طرح موت کو غیر یقینی بنانے کے لئے اس کے اسباب کی جتنی چھان بین کی گئی ہے، وہ سب ناکامی پر ختم ہوئی ہے، اور یہ امکان اب بھی بدستور باقی ہے کہ سارے انسانوں کو ایک مقررہ مدت پر مرنا ہے، اور ایسا کوئی امکان اب تک ثابت نہ ہو سکا کہ موت نہیں آئے گی، ڈاکٹر الکسس کیرل نے اسی مسئلہ پر زمان داخلی (Inward Time) کے عنوان سے لمبی بحث کی ہے، اور اس سلسلے کی کوششوں کی ناکامی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"انسان بقا کی تلاش اور جستجو سے کبھی نہیں اکتائے گا، مگر اس کو کبھی یہ چیز حاصل نہیں ہوسکتی، کیونکہ وہ جسمانی ساخت کے چند قوانین کا پابند ہے، وہ عضویاتی زمان (Physiological Time) کو روکنے اور غالباً ایک حد تک اس کو پیچھے ہٹانے میں کامیاب ہوسکتا ہے[1]، لیکن وہ موت پر کبھی فتح نہیں پاسکتا۔"

Man the Unknown.
p. 175

اسی طرح نظام کائنات کی موجودہ شکل کا درہم برہم ہونا بھی ایک ایسی چیز ہے، جو بالکل واقعاتی طور پر سمجھ میں آتی ہے، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ کائنات میں ہم جن چھوٹی چھوٹی قیامتوں سے واقف ہیں، وہی آئندہ کسی وقت زیادہ بڑے پیمانے پر ظاہر ہونے والی ہے، یہ صرف موجودہ مقامی قیامتوں کے عالمی پیمانے پر واقع ہونے کی پیشین گوئی ہے۔

سب سے پہلا تجربہ جو ہم کو قیامت کے امکان سے باخبر کرتا ہے، وہ زلزلہ ہے، زمین کا اندرونی حصہ نہایت گرم سیال کی شکل میں ہے جس کا مشاہدہ آتش فشاں پہاڑوں سے نکلنے والے لاوا کی شکل میں ہوتا ہے، یہ مادہ مختلف شکلوں میں زمین کی سطح کو متاثر کرتا ہے، جس کی وجہ سے بعض اوقات زمین کے اوپر زبردست گڑگڑاہٹ کی آواز محسوس ہوتی ہے، اور کش مکش کی وجہ سے جھٹکے پیدا ہوتے ہیں ـــــ اسی کا نام زلزلہ ہے، یہ زلزلہ آج بھی انسان کے لئے سب سے زیادہ خوفناک لفظ ہے، یہ انسان کے اوپر قدرت کا ایسا حملہ ہے جس میں فیصلے کا اختیار تمام تر دوسرے فریق کو ہوتا ہے، زلزلہ کے مقابلے میں انسان بالکل بے بس ہے، یہ زلزلے ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ ہم ایک سرخ پگھلے ہوئے نہایت گرم مادے کے اوپر آباد ہیں، جس سے صرف ۵۰ کیلومیٹر کی ایک پتلی سی چٹانی تہہ ہم کو الگ کرتی ہے، جو زمین کے مقابلے میں ویسی ہی ہے جیسے سیب کے اوپر اس کا باریک چھلکا، ایک جغرافیہ داں کے الفاظ میں ہمارے آباد شہروں اور نیلے سمندروں کے نیچے ایک قدرتی جہنم (Physical Hell) دہک رہا ہے، یا یوں کہنا چاہیے کہ ہم ایک عظیم ڈائنامیٹ کے اوپر

---

[1] یعنی جوانی کی مدت کو بڑھانے اور بڑھاپے کو موخر کرنے میں۔

کھڑے ہیں، جو کسی بھی وقت پھٹ کر سارے نظامِ ارضی کو درہم برہم کر سکتا ہے۔

George Gamow,
Biography of the Earth, p. 82

یہ زلزلے دنیا کے تقریباً ہر حصے میں اور ہر روز آتے ہیں، لیکن جغرافیائی اعتبار سے وہ زیادہ تعداد میں وہاں محسوس ہوتے ہیں، جہاں آتش فشاں پہاڑ ہیں، سب سے قدیم تباہ کن زلزلہ جس سے تاریخ واقف ہے، وہ چین کے صوبہ شنسی (Shensi) کا زلزلہ ہے، جو ۱۵۵۶ء میں آیا تھا، اس زلزلے میں آٹھ لاکھ سے زیادہ اشخاص ہلاک ہو گئے، اسی طرح یکم نومبر ۱۷۵۵ء کو پرتگال میں زلزلہ آیا جس نے لزبن (Lisbon) کا پورا شہر تباہ کر دیا، اس زلزلے میں چھ منٹ کے اندر تیس ہزار آدمی ہلاک ہو گئے، تمام عمارتیں مسمار ہو گئیں، اندازہ کیا گیا ہے، کہ اس زلزلے میں یورپ کے رقبہ کا چوگنا حصہ ہل گیا تھا، اسی نوعیت کا ایک شدید زلزلہ ۱۸۹۷ء میں آسام میں آیا تھا، جو دنیا کے پانچ انتہائی بڑے زلزلوں میں شمار ہوتا ہے، اس سے شمالی آسام میں ہولناک تباہی آئی تھی، اس زلزلے نے دریائے برہم پتر کا رخ بدل دیا اور ایورسٹ کی چوٹی ابھر کر سو فٹ اوپر چلی گئی۔

زلزلہ دراصل چھوٹے پیمانے کی قیامت ہے، جب دہشت انگیز گڑگڑاہٹ کے ساتھ زمین پھٹ جاتی ہے، جب پختہ مکانات تاش کے پتوں کے گھروندے کی طرح گرنے لگتے ہیں، جب زمین کا اوپری حصہ دھنس جاتا ہے، اور اندرونی حصہ اوپر آجاتا ہے، جب آباد ترین شہر چند لمحوں میں وحشت ناک کھنڈر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، جب انسان کی لاشیں اس طرح ڈھیر ہو جاتی ہیں، جیسے مری ہوئی مچھلیاں زمین کے اوپر پڑی ہوں —— یہ زلزلے کا وقت ہوتا ہے، اس وقت انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ قدرت کے مقابلے میں کس قدر بے بس ہے، یہ زلزلے بالکل اچانک آتے ہیں، درحقیقت زلزلے کا المیہ اس امر میں پوشیدہ ہے کہ کوئی بھی شخص یہ پیشین گوئی نہیں کر سکتا کہ زلزلہ کب اور کہاں آئے گا، یہ زلزلے گویا اچانک آنے والی قیامت کی پیشگی اطلاع ہیں، یہ ہمیں بتاتے ہیں کہ زمین کا مالک کس طرح زمین کے موجودہ نظام کو توڑنے پر پوری طرح قادر ہے۔

یہی حال بیرونی کائنات کا ہے، کائنات نام ہے 'ایک ایسے لامحدود خلا کا جس میں بے انتہا بڑے بڑے آگ کے الاؤ (ستارے) بے شمار تعداد میں اندھا دھند گردش کر رہے ہیں، جیسے بے شمار لٹو کسی فرش پر ہماری تمام سواریوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ مسلسل ناچ رہے ہوں،

یہ گردش کسی بھی وقت زبردست ٹکراؤ کی صورت اختیار کر سکتی ہے، اس وقت کائنات کی حالت بہت بڑے پیمانے پر ایسی ہی ہو گی جیسے کروروں بمبار ہوائی جہاز بموں سے لدے ہوئے فضا میں اڑ رہے ہوں اور یکایک سب کے سب باہم ٹکرا جائیں، اجرام سماوی کا اس قسم کا ٹکراؤ کسی بھی درجہ میں حیرت انگیز نہیں ہے بلکہ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ وہ آخر ٹکراتے کیوں نہیں جاتے، علم الافلاک کا مطالعہ بھی بتاتا ہے کہ ستاروں کا باہم ٹکرا جانا ممکن ہے، چنانچہ شمسی نظام کے وجود میں آنے کی ایک توجیہ اسی قسم کے ٹکراؤ پر کی گئی ہے، اس ٹکراؤ کو اگر ہم بڑے پیمانے پر قیاس کر سکیں تو ہم نہایت آسانی سے زیر بحث امکان کو سمجھ سکتے ہیں، کیونکہ دراصل اسی واقعہ کا دوسرا نام "قیامت" ہے، نظریۂ آخرت کا یہ دعویٰ کہ کائنات کا موجودہ نظام ایک روز درہم برہم ہو جائے گا' اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ جو واقعہ کائنات کے اندر ابتدائی شکل میں موجود ہے، وہی ایک روز انتہائی شکل میں پیش آنے والا ہے —— قیامت کا آنا ہمارے لئے ایک معلوم حقیقت ہے —— فرق صرف یہ ہے کہ آج ہم اسے امکان کی حد تک جانتے ہیں —— اور کل اسے واقعہ کی صورت میں دیکھیں گے۔

آخرت کے امکان کے سلسلے میں دوسرا مسئلہ زندگی بعد موت کا مسئلہ ہے، "کیا مرنے کے بعد بھی کوئی زندگی ہے" موجودہ ذہن اپنے آپ سے سوال کرتا ہے' اور پھر خود ہی اس کا جواب دیتا ہے —— "نہیں مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں، کیونکہ ہم جس زندگی سے واقف ہیں وہ مادی عناصر کی ایک خاص ترتیب کے اندر پائی جا سکتی ہے، موت کے بعد یہ ترتیب باقی نہیں رہتی، اس لئے موت کے بعد کوئی زندگی بھی نہیں ہو سکتی"

ٹی، آر، مائلز T.R. Miles بعث بعد الموت کو محض ایک تمثیلی حقیقت قرار دیتا ہے' اور اس کو ایک لفظی حقیقت (Literal Truth) کے طور پر ماننے سے انکار کرتا ہے' "میرے نزدیک

وہ کہتا ہے "یہ ایک مضبوط مقدمہ ہے کہ مرنے کے بعد آدمی زندہ رہتا ہے، یہ بالکل لفظی طور پر ایک حقیقت ہو سکتی ہے اور اس قابل ہے کہ تجربے سے اس کا غلط یا صحیح ہونا معلوم کیا جا سکے، مشکل صرف یہ ہے کہ جب تک ہم کو موت نہ آئے، اس کا قطعی جواب معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، مگر یہ قیاس کرنا ممکن ہے۔" اب چونکہ قیاس اس کے خلاف ہے، اس لئے اس کے نزدیک یہ لفظی حقیقت نہیں، وہ قیاس یہ ہے:۔

"علم الاعصاب (Neurology) کے مطابق خارجی دنیا اور اس سے تعلقات کا علم صرف اس وقت ممکن ہے، جب کہ انسانی دماغ معمول کے مطابق کام کر رہا ہو اور موت کے بعد جبکہ دماغ کی تنظیم منتشر ہو جاتی ہے، اس قسم کا ادراک (Awareness) ناممکن ہے۔"[1]

مگر اس سے زیادہ قوی قیاسات دوسرے موجود ہیں، جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جسم کے ذرات مادی کا انتشار زندگی کو ختم نہیں کرتا، زندگی ایک الگ اور مستقل بالذات چیز ہے، جو ذرات کی تبدیلی کے باوجود باقی رہتی ہے

ہم جانتے ہیں کہ انسان کا جسم بعض خاص قسم کے اجزا سے مل کر بنا ہے، جس کی مجموعی اکائی کو خلیہ (Cell) کہتے ہیں، یہ خلیے نہایت پیچیدہ ساخت کے چھوٹے چھوٹے ریزے ہیں، جن کی تعداد ایک متوسط قد کے انسان میں تقریباً ۲۶ پدم ہوتی ہے، یہ گویا بے شمار چھوٹی چھوٹی اینٹیں ہیں، جن کے ذریعہ ہمارے جسم کی عمارت تعمیر ہوئی ہے، فرق یہ ہے کہ عمارت کی اینٹیں پوری زندگی بھر وہی کی وہی رہتی ہیں، جو شروع میں اس کے اندر لگائی گئی تھیں، مگر جسم کی اینٹیں ہر وقت بدلتی رہتی ہیں، جس طرح ہر چلنے والی مشین کے اندر گھساؤ (Depreciation) کا عمل ہوتا ہے، اسی طرح ہماری جسمانی مشین بھی گھستی ہے اور اس کی "اینٹیں"[2] مسلسل ٹوٹ ٹوٹ کر کم ہوتی رہتی ہیں، یہ کمی غذا سے پوری ہوتی ہے، غذا ہضم ہو کر ہمارے جسم

---

[1] *Religion and the Scientific Outlook*, p. 206

[2] خلیہ کو "اینٹ" یہاں محض ظاہری شابہت کی بنا پر کہا گیا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ خلیہ ایک نہایت پیچیدہ مرکب ہے جو بذاتِ خود ایک مکمل جسم رکھتا ہے اور اس کے مطالعہ کے لئے ایک علیحدہ سائنس وجود میں آچکی ہے جس کا نام Cytology ہے

کے لئے وہ تمام اینٹیں مہیا کرتی ہے، جو ٹوٹ پھوٹ کی وجہ سے ہر روز ہمارے جسم کو درکار ہوتی ہیں گویا جسم نام ہے خلیوں کے ایک ایسے مرکب کا جو ہر آن اپنے آپ کو بدلتا رہتا ہو، اس کی مثال بہتے ہوئے دریا کے ایک گھاٹ کی ہے جو ہر وقت پانی سے بھرا رہتا ہے مگر ہر وقت وہی پانی نہیں ہوتا جو پہلے تھا بلکہ ہر آن وہ اپنے پانی کو بدل دیتا ہے، گھاٹ وہی ہوتا ہے، مگر پانی وہی نہیں ہوتا۔

اس طرح ہر آن ہمارے جسم میں ایک تبدیلی ہوتی رہتی ہے، یہاں تک کہ ایک وقت آتا ہے، جب جسم کی پچھلی تمام اینٹیں ٹوٹ کر نکل جاتی ہیں، اور ان کی جگہ مکمل طور پر نئی اینٹیں لے لیتی ہیں، بچے کے جسم میں یہ عمل جلد جلد ہوتا ہے، اور عمر کے بڑھنے سے اس کی رفتار سست ہوتی رہتی ہے، اگر پوری عمر کا اوسط لگایا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر دس سال میں جسم کے اندر یہ تبدیلی واقع ہوتی ہے، ظاہری جسم کے خاتمے کا یہ عمل برابر ہوتا رہتا ہے، مگر اندر کا انسان اسی طرح اپنی اصل حالت میں موجود رہتا ہے، اس کا علم، اس کا حافظہ اس کی تمنائیں، اس کی عادتیں اس کے تمام خیالات بدستور باقی رہتے ہیں، وہ اپنی عمر کے ہر مرحلے میں اپنے آپ کو وہی سابق "انسان" محسوس کرتا ہے، جو پہلے تھا، حالانکہ اس کی آنکھ، کان، ناک، ہاتھ، پاؤں غرض ناخن سے بال تک ہر ہر چیز بدل چکی ہوتی ہے۔

اب اگر جسم کے خاتمہ کے ساتھ اس جسم کا انسان بھی مرجاتا ہو تو خلیوں کی تبدیلی سے اسے بھی متاثر ہونا چاہئے، مگر ہم جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوتا، یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ انسان یا انسانی زندگی جسم سے الگ کوئی چیز ہے جو جسم کی تبدیلی اور موت کے باوجود اپنا وجود باقی رکھتی ہے، وہ ایک گھاٹ ہے جس کی گہرائی میں اجسام یا دوسرے الفاظ میں خلیوں کی ایک مسلسل آمد و رفت جاری ہے، چنانچہ ایک سائنس داں نے حیات یا انسانی ہستی کو ایک ایسی مستقل بالذات چیز قرار دیا ہے، جو مسلسل تغیرات کے اندر غیر متغیر حالت میں اپنا وجود باقی رکھتی ہے — اس کے الفاظ میں:۔

Personality is changelessness in change.

اگر موت محض جسم کے خاتمے کا نام ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایسے ہر عمل کی تکمیل کے بعد گویا انسان ایک بار مرگیا، اب اگر ہم اس کو دیکھتے ہیں تو یہ دراصل اس کی دوسری زندگی ہے، جو اس نے مرکر حاصل کی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ پچاس سال کی عمر کا ایک زندہ شخص جس کو ہم اپنی آنکھوں سے چلتا پھرتا دیکھتے ہیں، وہ اپنی اس مختصر سی زندگی میں کم از کم پانچ بار مکمل طور پر مرچکا ہے، پانچ بار کی جسمانی موت سے اگر ایک انسان نہیں مرا تو چھٹی بار کی موت کے بارے میں آخر کیوں یقین کر لیا گیا ہے کہ اس کے بعد وہ لازماً مر جائے گا، اس کے بعد اس کے لئے زندگی کی کوئی صورت نہیں۔

بعض لوگ اس دلیل کو تسلیم نہیں کریں گے، وہ کہیں گے کہ وہ ذہن یا اندرونی وجود جس کو تم انسان کہتے ہو، وہ دراصل کوئی علیحدہ چیز نہیں ہے بلکہ خارجی دنیا کے ساتھ جسم کے تعلق سے پیدا ہوا ہے، تمام جذبات وخیالات مادی عمل کے دوران میں اسی طرح پیدا ہوتے ہیں، جس طرح دھات کے دو ٹکڑوں کی رگڑ سے حرارت پیدا ہوتی ہے، جدید فلسفہ روح کے مستقل وجود کا انتہائی مخالف ہے، جیمز کہتا ہے، کہ شعور ایک ہستی (Entity) کے طور پر موجود نہیں ہے بلکہ ایک عمل (Function) کے طور پر موجود ہے، وہ ایک کارروائی (Process) ہے، ہمارے زمانے کے فلسفیوں کی بہت بڑی تعداد نے اصرار کیا ہے کہ شعور اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ خارج سے پیدا ہونے والے ایک ہیجان کا عصبی جواب (Nervous Response) ہے، اس تصور کے مطابق موت یعنی جسمانی نظام کے منتشر ہونے کے بعد انسان کی موجودگی کا کوئی سوال نہیں، کیونکہ وہ مرکز اعصاب ہی اس کے بعد باقی نہیں رہا، جو خارجی دنیا کے تعامل سے زندگی کا جواب ظاہر کرے نتیجہ یہ نکلا کہ زندگی بعد موت کا تصور بالکل غیر عقلی تصور ہے ــــ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

میں کہوں گا کہ انسان کی حقیقت اگر یہی ہے تو یقیناً ہمارے لئے ممکن ہونا چاہئے کہ ہم ایک زندہ اور باشعور انسان کو پیدا کر سکیں، آج ہم اچھی طرح جانتے ہیں، کہ انسان کا جسم کن عناصر سے مل کر بنتا ہے، یہ تمام عناصر بہت کثیر مقدار میں زمین کے اندر اور اس کی فضا میں قابل حصول حالت میں موجود ہیں، ہم نے جسم کے

اندرونی نظام کو انتہائی باریک بینی کے ساتھ معلوم کرلیا ہے، آج ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ انسانی جسم کا ڈھانچہ اور اس کے رگ وریشے کس طرح بنائے گئے ہیں، پھر ہمارے پاس ایسے بے شمار ماہر آرٹسٹ موجود ہیں، جو کمال درجہ مطابقت کے ساتھ انسان کی مانند ایک جسم بنا کر کھڑا کردیں، مخالفین روح کو اگر اپنے نظریے پر یقین ہے تو وہ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ بہت سے انسانی جسم تیار کرکے زمین کے مختلف حصوں میں کھڑا کردیں، اور اس وقت کا انتظار کریں جب خارجی دنیا کے اثرات پڑنے سے یہ ڈھانچے چلنے اور بولنے لگیں گے۔

یہ زندگی کے باقی رہنے کے امکان کی بحث تھی، اب اس مقصد کے اعتبار سے غور کیجئے جس کے لئے مذہب دوسری زندگی کے اوپر عقیدہ رکھتا ہے، مذہبی تصور کے مطابق زندگی کا بقا شئے کی "آمد ورفت" کا نام نہیں ہے جو شیشہ ساعت (Sand Glass) کی طرح بس خالی اور پر ہوتی رہے، اس سے آگے اس کا اور کوئی مقصد نہ ہو ــــــ بلکہ دوسری زندگی کا ایک عظیم مقصد ہے، اور وہ یہ کہ موجودہ دنیا کی اچھائیوں اور برائیوں کا بدلہ دیا جائے۔

عقیدۂ آخرت کا یہ جزو بھی اس وقت بالکل ممکن نظر آنے لگتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات میں حیرت انگیز طور پر ہر شخص کا نامۂ اعمال رات دن ایک لمحہ کے وقفہ کے بغیر ضبط (Record) کیا جا رہا ہے آدمی تین شکلوں میں اپنی ہستی کو ظاہر کرتا ہے ــــــ نیت، قول اور عمل، یہ تینوں چیزیں مکمل طور پر محفوظ کی جا رہی ہیں، ہمارا ہر خیال، ہماری زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ اور ہماری تمام کارروائیاں کائنات کے پردہ پر اس طرح نقش ہو رہی ہیں کہ کسی بھی وقت ان کو نہایت صحت کے ساتھ دہرایا جاسکے، اور یہ معلوم ہوسکے کہ دنیا کی زندگی میں کس نے کیا کہا، کس کی زندگی شر کی زندگی تھی، اور کس کی زندگی خیر کی زندگی۔

جو خیالات ہمارے دل میں گزرتے ہیں، ہم بہت جلد انھیں بھول جاتے ہیں، اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئے، مگر جب ہم مدتوں کی ایک بھولی ہوئی بات کو خواب میں دیکھتے ہیں یا ذہنی اختلال کے بعد آدمی ایسی باتیں بولنے لگتا ہے جو اس کے فراموش شدہ ماضی سے متعلق ہیں، تو یہ واقعہ

ظاہر کرتا ہے کہ آدمی کا حافظہ اتنا ہی نہیں ہے، جتنا شعوری طور پر وہ محسوس کرتا ہے، حافظہ کے کچھ خانے ایسے بھی ہیں، جو بظاہر شعور کی گرفت میں نہیں رہتے، مگر وہ موجود ہوتے ہیں۔

یہ اور اس طرح کے دوسرے تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ ہمارے تمام خیالات مستقل طور پر اپنی پوری شکل میں محفوظ رہتے ہیں، حتیٰ کہ ہم چاہیں بھی تو انھیں محو نہیں کر سکتے، یہ تحقیقات بتاتی ہیں کہ انسانی شخصیت صرف وہی نہیں ہے، جسے ہم شعور کہتے ہیں، بلکہ اس کے برعکس نفس انسانی کا ایک حصہ ایسا بھی ہے، جو ہمارے شعور کی سطح کے نیچے موجود رہتا ہے، یہ حصہ جسے فرائڈ تحت شعور (Sub-Conscious) یا لاشعور (Unconscious) کا نام دیتا ہے، یہ ہماری شخصیت کا بہت بڑا حصہ ہے، نفس انسانی کی مثال سمندر میں تیرتے ہوئے تودۂ برف (Iceberg) کی سی ہے، جس کا صرف نواں حصہ پانی کے اوپر دکھائی دیتا ہے، اور بقیہ آٹھ حصے سطح سمندر کے نیچے رہتے ہیں، یہی تحت شعور ہے جو ہمارے تمام خیالات اور ہماری نیتوں کو محفوظ رکھتا ہے، فرائڈ اپنے اکتیسویں لکچر میں کہتا ہے:۔

> ”منطق کے قوانین بلکہ اضداد کے اصول بھی لاشعور (Id) کے عمل پر حاوی نہیں ہوتے، مخالف خواہشات ایک دوسرے کو زائل کئے بغیر اس میں پہلو بہ پہلو ہمیشہ موجود رہتی ہیں........ لاشعور میں کوئی ایسی چیز نہیں جو نفی سے مشابہت رکھتی ہو، اور ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ لاشعور کی دنیا میں فلسفیوں کا یہ دعویٰ غلط ہو جاتا ہے کہ ہمارے تمام دماغی افعال وقت اور فاصلہ کے درمیان واقع ہوتے ہیں، لاشعور کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جو وقت کے تصور سے مطابقت رکھتی ہو، لاشعور میں وقت کے گزرنے کا کوئی نشان نہیں اور یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے جس کے معنی سمجھنے کی طرف ابھی تک فلسفیوں نے پوری توجہ نہیں کی کہ وقت کے گزرنے سے ذہنی عمل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ایسے خیالات (Conative Impulses) جو کبھی لاشعور سے باہر نہیں آئے بلکہ وہ ذہنی تاثرات بھی جنھیں روک کر لاشعور میں دبا دیا گیا ہو، فی الواقع غیر فانی ہوتے ہیں اور دسیوں سال تک اسی طرح محفوظ

رہتے ہیں، گویا ابھی کل وجود میں آئے ہیں۔

New Introductory Lectures on Psycho-Analysis,
London, 1969, p. 99

تحت شعور کا یہ نظریہ اب نفسیات میں عام طور پر تسلیم کیا جا چکا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر بات جو آدمی سوچتا ہے اور ہر اچھا یا برا خیال جو اس کے دل میں گزرتا ہے، وہ سب کا سب نفس انسانی میں اس طرح نقش ہو جاتا ہے کہ پھر کبھی نہیں مٹتا۔ وقت کا گزرنا یا حالات کا بدلنا اس کے اندر ذرہ برابر کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا — یہ واقعہ انسانی ارادہ کے بغیر ہوتا ہے، خواہ انسان اسے چاہے یا نہ چاہے۔

فرائڈ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ نیات اور اعمال کا اس احتیاط اور حفاظت کے ساتھ تحت شعور میں ضبط رہنا کارخانۂ قدرت کے اندر کون سے مقصد کو پورا کرتا ہے، اس لئے وہ فلسفیوں کو اس مسئلے پر سوچنے کی دعوت دیتا ہے، مگر اس واقعہ کو آخرت کے نظریے کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو فوراً اس کی معنویت سمجھ میں آجاتی ہے، یہ واقعہ صریح طور پر اس امکان کو ظاہر کرتا ہے کہ جب دوسری زندگی شروع ہوگی تو ہر شخص اپنے پورے نامۂ اعمال کے ساتھ وہاں موجود ہوگا، آدمی کا خود اپنا وجود گواہی دے رہا ہوگا کہ کن نیتوں اور کن خیالات کے ساتھ اس نے دنیا میں زندگی بسر کی تھی۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا	اور ہم نے بنایا انسان کو اور ہم جانتے ہیں جو باتیں
تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ وَنَحْنُ أَقْرَبُ	آتی رہتی ہیں اس کے جی میں، اور ہم اس کے رگِ
إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ۔ (ق - ۱۶)	جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

اب قول کے مسئلے کو لیجئے، نظریۂ آخرت یہ کہتا ہے کہ آدمی اپنے اقوال کے لئے جواب دہ ہے، آپ خواہ بھلی بات کہیں یا کسی کو گالی دیں، آدمی اپنی زبان کو سچائی کا پیغام پہنچانے کے لئے استعمال کرے یا وہ شیطان کا مبلغ بن جائے، ہر حال میں ایک کائناتی انتظام کے تحت اس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کا مکمل ریکارڈ تیار کیا جا رہا ہے (مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ)، اور یہ ریکارڈ آخرت کی عدالت میں

حساب کے لئے پیش ہوگا،

یہ بھی ایسی چیز ہے جس کا ممکن الوقوع ہونا ہماری معلوم دنیا کے عین مطابق ہے، ہم جانتے ہیں کہ جب کوئی شخص بولنے کے لئے اپنی زبان کو حرکت دیتا ہے تو اس حرکت سے ہوا میں لہریں پیدا ہوتی ہیں جس طرح ساکن پانی میں پتھر پھینکنے سے لہریں پیدا ہوتی ہیں، اگر آپ ایک برقی گھنٹی کو شیشے کے اندر مکمل طور پر بند کردیں اور بجلی کے ذریعہ سے اسے بجائیں تو آنکھوں کو وہ گھنٹی بجتی ہوئی نظر آئے گی، مگر آواز سنائی نہیں دے گی، کیونکہ شیشہ بند ہونے کی وجہ سے اس کی لہریں ہمارے کانوں تک نہیں پہنچ رہی ہیں، یہی لہریں ہیں، جو "آواز" کی صورت میں ہمارے کان کے پردے سے ٹکراتی ہیں، اور کان کے آلات انھیں اخذ کر کے ان کو ہمارے دماغ تک پہنچا دیتے ہیں، اور اس طرح ہم بولے ہوئے الفاظ کو سمجھنے لگتے ہیں جس کو "سننا" کہا جاتا ہے۔

ان لہروں کے سلسلے میں یہ ثابت ہوچکا ہے کہ وہ ایک مرتبہ پیدا ہونے کے بعد مستقل طور پر فضا میں باقی رہتی ہیں، اور یہ ممکن ہے کہ کسی بھی وقت انھیں دہرایا جاسکے، اگرچہ سائنس ابھی اس قابل نہیں ہوئی ہے کہ ان آوازوں یا صحیح تر الفاظ میں ان لہروں کو گرفت کرسکے جو قدیم ترین زمانے سے فضا میں حرکت کررہی ہیں، اور نہ ابھی تک اس سلسلے میں کوئی خاص کوشش ہوئی ہے، تاہم نظری طور پر یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ ایسا آلہ بنایا جاسکتا ہے جس سے زمانۂ قدیم کی آوازیں فضا سے لے کر اسی طرح سنی جاسکیں جس طرح ہم ریڈیو سٹ کے ذریعہ ان لہروں کو فضا سے وصول کر کے سنتے ہیں، جو کسی براڈکاسٹنگ اسٹیشن سے بھیجی گئی ہوں۔

فی الحال اس سلسلے میں جو مشکل ہے، وہ ان کو گرفت کرنے کی نہیں ہے، بلکہ الگ کرنے کی ہے، ایسا آلہ بنانا آج بھی ممکن ہے، جو قدیم آوازوں کو گرفت کرسکے، مگر ابھی ہم کو ایسی کوئی تدبیر نہیں معلوم جس کے ذریعہ سے بے شمار ملی ہوئی آوازوں کو الگ کر کے سنا جاسکے، یہی وقت ریڈیو نشریات میں بھی ہے، مگر اس کو ایک مصنوعی طریقہ اختیار کر کے حل کرلیا گیا ہے، دنیا بھر میں سیکڑوں ریڈیو اسٹیشن ہیں، جو ہر وقت مختلف قسم کے پروگرام نشر کرتے رہتے ہیں، یہ تمام پروگرام ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار سے ہر وقت ہمارے

گردوپیش گزرتے رہتے ہیں، بظاہر یہ ہونا چاہیے کہ جب ہم ریڈیو کھولیں تو بیک وقت بہت سی ناقابلِ فہم آوازیں ہمارے کمرے میں گونجنے لگیں، مگر ایسا نہیں ہوتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام نشرگاہیں اپنی اپنی آواز کو مختلف طولِ موج پر نشر کرتی ہیں، کوئی چھوٹی کوئی بڑی، اس طرح مختلف نشرگاہوں سے نکلی ہوئی آوازیں مختلف طول کی موجوں میں فضا کے اندر پھیلتی ہیں، اب جہاں کی آواز جس میٹر بینڈ پر نشر کی جاتی ہے، اس پر اپنے ریڈیو سٹ کی سوئی گھما کر ہم وہاں کی آواز سن لیتے ہیں۔

اسی طرح غیر مصنوعی آوازوں کو الگ کرنے کا کوئی طریقہ ابھی دریافت نہیں ہوا ہے، ورنہ آج بھی ہم ہر زمانے کی تاریخ کو اس کی اپنی آوازمیں سن سکتے تھے، تاہم اس سے یہ امکان قطعی طور پر ثابت ہوجاتا ہے کہ آئندہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے، اس تجربہ کی روشنی میں نظریۂ آخرت کا یہ جزو ہمارے لئے بعید از قیاس نہیں رہتا کہ انسان جو کچھ بولتا ہے، وہ سب ریکارڈ ہو رہا ہے، اور اس کے مطابق ایک روز ہر شخص کو جواب دہی کرنی ہوگی، ایران کے سابق وزیر اعظم ڈاکٹر مصدق ۱۹۵۳ء میں جب مقدمے کے دوران میں نظربند تھے تو ان کے کمرے میں خفیہ طور پر ایسی ریکارڈنگ مشینیں لگا دی گئی تھیں، جو ہر وقت متحرک رہتی تھیں، اور ان کی زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو ریکارڈ کر لیتی تھیں تاکہ عدالت میں ان کو ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکے ہمارا مطالعہ بتاتا ہے کہ اسی طرح ہر شخص کے ساتھ خدا کے فرشتے یا دوسرے لفظوں میں بہت سے غیر مرئی حافظین (Recorders) لگے ہوئے ہیں، جو ہمارے منہ سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو نہایت درجۂ صحت کے ساتھ کائنات کی پلیٹ پر نقش کر رہے ہیں۔

اب عمل کے مسئلہ کو لیجئے، اس سلسلے میں بھی ہماری معلومات حیرت انگیز طور پر اس کا ممکن الوقوع ہونا ثابت کرتی ہیں، سائنس بتاتی ہے کہ ہمارے تمام اعمال، خواہ وہ اندھیرے میں کئے گئے ہوں یا اجالے میں، تنہائی میں ان کا ارتکاب ہوا ہو یا مجمع کے اندر، سب کے سب فضا میں تصویری حالت میں موجود ہیں، اور کسی بھی وقت ان کو یکجا کر کے ہر شخص کا پورا کارنامۂ حیات معلوم کیا جا سکتا ہے۔

جدید تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ ہر چیز خواہ وہ اندھیرے میں ہو یا اجالے میں، ٹھہری ہوئی ہو یا حرکت کر رہی ہو، وہ جہاں یا جس حالت میں ہو، اپنے اندر سے مسلسل حرارت خارج کرتی رہتی ہے، یہ حرارت چیزوں کے ابعاد واشکال کے اعتبار سے اس طرح نکلتی ہے کہ وہ بعینہٖ اس چیز کا عکس ہوتی ہے جس سے وہ نکلی ہے، جس طرح آواز کی لہریں اس مخصوص تھرتھراہٹ کا عکس ہوتی ہیں، جو کسی زبان پر جاری ہوئی تھی، چنانچہ ایسے کیمرے ایجاد کئے گئے ہیں، جو کسی چیز سے نکلی ہوئی حرارتی لہروں (Heat Waves) کو اخذ کر کے اس کی اس مخصوص حالت کا فوٹو تیار کر دیتے ہیں جبکہ وہ لہریں اس سے خارج ہوئی تھیں، مثلاً میں اس وقت ایک مسجد میں بیٹھا ہوا لکھ رہا ہوں، اس کے بعد میں یہاں سے چلا جاؤں گا، مگر یہاں اپنی موجودگی کے دوران میں میں نے جو حرارتی لہریں خارج کی ہیں، وہ بدستور موجود رہیں گی اور حرارت دیکھنے والی مشین کی مدد سے خالی شدہ مقام سے میرا مکمل فوٹو حاصل کیا جا سکتا ہے، البتہ اس وقت جو کیمرے بنے ہیں وہ چند گھنٹے بعد ہی تک کسی لہر کا فوٹو لے سکتے ہیں، اس کے بعد کی لہروں کا عکس اتارنے کی طاقت ان میں نہیں ہے

ان کیمروں میں انفرارڈ شعاعوں سے کام لیا جاتا ہے، اس لئے وہ اندھیرے اور اجالے میں یکساں فوٹو لے سکتی ہیں، امریکہ اور انگلینڈ میں اس دریافت سے کام لینا شروع ہو گیا ہے، چند سال پہلے کی بات ہے، ایک رات نیویارک کے اوپر ایک پُراسرار ہوائی جہاز چکر لگا کر چلا گیا، اس کے فوراً بعد مذکورہ بالا کیمرے کے ذریعہ فضا سے اس کی حرارتی تصویر لی گئی، اس کے مطالعہ سے معلوم ہو گیا کہ اڑنے والا جہاز کس ساخت کا تھا، (ریڈرز ڈائجسٹ، نومبر ۱۹۶۰ء) اس کیمرے کو مصور حرارت (Evaporagraph) کہتے ہیں، اس کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستان ٹائمز نے لکھا تھا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ ہم تاریخ کو پردۂ فلم کے اوپر دیکھ سکیں گے اور ہو سکتا ہے کہ پچھلے ادوار کے بارے میں ایسے ایسے انکشافات ہوں جو ہمارے موجودہ تاریخی نظریات کو بالکل بدل ڈالیں۔

یہ ایک حیرت انگیز دریافت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح فلم اسٹوڈیو میں نہایت تیز

رفتار کیمرے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تمام حرکات وسکنات کی تصویر لیتے رہتے ہیں اسی طرح عالمی پیمانے پر ہر شخص کی زندگی فلمائی جارہی ہے، آپ خواہ کسی کو تھپڑ ماریں یا کسی غریب کا بوجھ اٹھادیں، اچھے کام میں مصروف ہوں یا برے کام کے لئے دوڑ دھوپ کر رہے ہوں، اندھیرے میں ہوں یا اجالے میں، جہاں اور جس حال میں ہوں، ہر وقت آپ کا تمام عمل کائنات کے پردہ پر نقش ہورہا ہے، آپ اسے روک نہیں سکتے، اور جس طرح فلم اسٹوڈیو میں دہرائی ہوئی کہانی کو اس کے بہت بعد اور اس سے بہت دور رہ کر ایک شخص اسکرین پر اس طرح دیکھتا ہے گویا وہ عین موقع واردات پر موجود ہو، ٹھیک اسی طرح ہر شخص نے جو کچھ کیا ہے اور جن واقعات کے درمیان اس نے زندگی گزاری ہے اس کی پوری تصویر ایک روز اس کے سامنے اس طرح آسکتی ہے کہ اس کو دیکھ کر وہ پکار اٹھے:

مَالِهٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا۔ (کہف - ۴۹)

یہ کیسا دفتر ہے جس نے میرا چھوٹا بڑا کوئی کام بھی درج کئے بغیر نہیں چھوڑا ہے۔

اوپر کی تفصیلات سے معلوم ہوا کہ دنیا میں ہر انسان کا مکمل اعمال نامہ تیار کیا جارہا ہے، جو خیال بھی آدمی کے دل میں گزرتا ہے، وہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوجاتا ہے، اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ نہایت صحت کے ساتھ ریکارڈ ہورہا ہے، ہر آدمی کے اردگرد ایسے کیمرے لگے ہوئے ہیں جو اندھیرے اور اجالے کی تمیز کئے بغیر شب وروز اس کا فلم تیار کر رہے ہیں، گویا انسان کا قلبی عمل ہو یا لسانی عمل یا عضوی عمل، ہر ایک نہایت باقاعدگی کے ساتھ درج کیا جارہا ہے، اس حیرت انگیز صورت حال کی توجیہہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ خدا کی عدالت میں ہر انسان کا جو مقدمہ پیش ہونے والا ہے، یہ سب اس کی شہادت فراہم کرنے کے انتظامات ہیں، جو خود عدالت کی طرف سے کئے گئے ہیں، کوئی بھی شخص ان واقعات کی اس سے زیادہ معقول توجیہہ پیش نہیں کرسکتا، اب اگر یہ صریح واقعہ بھی آدمی کو آخرت میں ہونے والی بازپرس کا یقین نہیں دلاتا، تو مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون سا واقعہ ہوگا جو اس کی آنکھ کھولے گا۔

تقاضا

اوپر ہم نے آخرت کے تصور پر اس حیثیت سے بحث کی ہے کہ موجودہ کائنات میں کیا اس قسم کی کسی آخرت کا واقع ہونا ممکن ہے جس کا مذہب میں دعویٰ کیا گیا ہے، اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ آخرت قطعی طور پر ممکن الوقوع ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ کیا ہماری دنیا کو اس قسم کی آخرت کی کوئی ضرورت بھی ہے، کیا کائنات اپنے موجودہ ڈھانچے کے اعتبار سے تقاضا کرتی ہے کہ آخرت لازماً وقوع میں آئے؟

سب سے پہلے نفسیاتی پہلو کو لیجئے ——— کننگھم نے اپنی کتاب (Plato's Apology) میں زندگی بعد موت کے عقیدے کو خوش کن لاادریت (Cheerful Agnosticism) کہا ہے، یہی موجودہ زمانے میں تمام بے خدا مفکرین کا نظریہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ دوسری زندگی کا عقیدہ انسان کی اس ذہنیت نے پیدا کیا ہے کہ وہ اپنے لئے ایک ایسی دنیا تلاش کرنا چاہتا ہے جہاں وہ موجودہ دنیا کی محدودیتوں اور مشکلات سے آزاد ہو کر خوشی اور فراغت کی ایک دل پسند زندگی حاصل کر سکے، یہ عقیدہ انسان کی محض ایک مفروضہ خوش فہمی ہے، جس کے ذریعہ وہ اس خیالی تسکین میں مبتلا رہنا چاہتا ہے کہ مرنے کے بعد وہ اپنی محبوب زندگی کو پالے گا، ورنہ جہاں تک حقیقت واقعہ کا تعلق ہے، ایسی کوئی دنیا واقعہ میں موجود نہیں ہے مگر انسان کی یہ طلب بذات خود آخرت کا ایک نفسیاتی ثبوت ہے، جس طرح پیاس کا لگنا پانی کی موجودگی اور پانی اور انسان کے درمیان ربط کا ایک داخلی ثبوت ہے، اسی طرح ایک بہتر دنیا کی طلب اس بات کا ثبوت ہے کہ ایسی ایک دنیا فی الواقع موجود ہے، اور ہم سے اس کا براہِ راست تعلق ہے، تاریخ بتاتی ہے کہ قدیم ترین زمانے سے عالمگیر پیمانے پر یہ طلب انسان کے اندر موجود رہی ہے، اب یہ ناقابل قیاس ہے کہ ایک بے حقیقت چیز اتنے بڑے پیمانے پر اور اس قدر ابدی شکل میں انسان کو متاثر کرے، ایک ایسا واقعہ جو ہمارے لئے اس امکان کا قرینہ پیدا کرتا ہے کہ دوسری بہتر دنیا موجود ہونی چاہئے، خود اسی واقعہ کو

فرضی قرار دینا صریح ہٹ دھرمی کے سوا اور کچھ نہیں۔

جو لوگ اتنے بڑے نفسیاتی تقاضے کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ غیر حقیقی ہے، مجھے نہیں معلوم کہ پھر اس زمین پر وہ کون سا واقعہ ہے جس کو وہ حقیقی سمجھتے ہیں، اور اگر سمجھتے ہیں تو اس کے لئے ان کے پاس کیسا دلیل ہے، یہ خیالات اگر صرف ماحول کا نتیجہ ہیں تو وہ انسانی جذبات کے ساتھ اتنی مطابقت کیوں رکھتے ہیں کیا دوسری کسی ایسی چیز کی مثال دی جا سکتی ہے، جو ہزاروں سال کے دوران میں اس قدر تسلسل کے ساتھ انسانی جذبات کے ساتھ اپنی مطابقت باقی رکھ سکی ہو، کیا کوئی بڑے سے بڑا قابل شخص یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ ایک فرضی چیز گڑھے اور اس کو انسانی نفسیات میں اس طرح شامل کر دے، جس طرح یہ احساسات انسانی نفسیات میں سموئے ہوئے ہیں۔

انسان کی بہت سی تمنائیں ہیں، جو اس دنیا میں پوری نہیں ہوتیں، انسان ایک ایسی دنیا چاہتا ہے جہاں صرف زندگی ہو، مگر اسے ایک ایسی دنیا ملی ہے، جہاں زندگی کے ساتھ موت کا قانون بھی نافذ ہے، یہ کتنی عجیب بات ہے کہ آدمی اپنے علم، تجربہ اور جدوجہد کے نتیجہ میں جب اپنی کامیاب ترین زندگی کے آغاز کے قابل ہوتا ہے، اسی وقت اس کے لئے موت کا پیغام آجاتا ہے، لندن کے کامیاب تاجروں کے متعلق اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہے کہ ۴۵۔۶۵ سال کی عمر کے درمیان جب وہ اپنا کاروبار خوب جما لیتے ہیں، اور پانچ ہزار تا دس ہزار پونڈ (ایک لاکھ روپے سے زیادہ) سالانہ کمانے ہوتے ہیں، اس وقت اچانک ایک روز ان کے دل کی حرکت بند ہو جاتی ہے، اور وہ اپنے پھیلے ہوئے کاروبار کو چھوڑ کر اس دنیا سے چلے جاتے ہیں، ونووڈ ریڈی (Winwood Reade) لکھتا ہے۔

> "یہ ہمارے لئے ایک غور طلب مسئلہ ہے کہ کیا خدا سے ہمارا کوئی ذاتی رشتہ ہے، کیا اس دنیا کے علاوہ کوئی اور دنیا ہے، جہاں ہمارے عمل کے مطابق ہم کو بدلہ دیا جائے گا، یہ نہ صرف فلسفہ کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، بلکہ یہ خود ہمارے لئے سب سے بڑا عملی سوال ہے، ایک ایسا سوال جس سے

ہمارا مفاد بہت زیادہ وابستہ ہے، موجودہ زندگی بہت مختصر ہے، اور اس کی خوشیاں بہت معمولی ہیں، جب ہم وہ کچھ حاصل کر لیتے ہیں، جو ہم چاہتے ہیں تو موت کا وقت قریب آچکا ہوتا ہے، اگر یہ واضح ہو سکے کہ ایک خاص طریقہ پر زندگی گزارنے سے دائمی خوشی حاصل ہو سکتی ہے، بیوقوف یا پاگل کے علاوہ کوئی بھی شخص اس طرح زندگی گزارنے سے انکار نہیں کرے گا۔"

Martyrdom of Man, p. 414

مگر یہی مصنف فطرت کی اتنی بڑی پکار کو محض ایک معمولی سے اشکال کی بنا پر رد کر دیتا ہے:۔

"یہ نظریہ اس وقت تک بظاہر بڑا معقول نظر آتا تھا جب تک گہرائی کے ساتھ ہم نے اس کی تحقیق نہیں کی تھی، مگر جب ایسا کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ محض ایک لغو (Absurd) بات ہے، اور اس کی لغویت کو بآسانی ثابت کیا جا سکتا ہے ـــــ محروم العقل آدمی جو کہ اپنے گناہوں کا ذمہ دار نہیں ہے، وہ تو جنت میں جائے گا، مگر گوئٹے اور روسو جیسے لوگ جہنم میں جلیں گے! اس لئے محروم العقل پیدا ہونا اس سے اچھا ہے کہ آدمی گوئٹے اور روسو کی شکل میں پیدا ہو، اور یہ بات بالکل لغو ہے۔"

(ایضاً صفحہ ۴۱۵)

یہ ویسی ہی بات ہے جیسے لارڈ کلون (Kelvin) نے میکس ویل Maxwell کی تحقیق کو ماننے سے انکار کر دیا تھا، لارڈ کلون کا کہنا تھا کہ "جب تک میں کسی چیز کا مشینی ماڈل Mechanical Model نہیں بنا لیتا، میں اسے سمجھ نہیں سکتا" اس بنا پر اس نے روشنی کے متعلق میکسویل کے برقی مقناطیسی نظریے کو قبول نہیں کیا، کیونکہ وہ اس کے مادی فریم میں نہیں آتی تھی، طبیعیات کی دنیا میں آج یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے، جے، ڈبلیو، این سولیون (Sullivan) کے الفاظ میں ـــــ "ایک شخص کیوں ایسا خیال کرے کہ فطرت کو ایک ایسی نوعیت کی چیز ہونا چاہئے جس کو انیسویں صدی کا ایک انجینئر اپنے کارخانہ میں ڈھال سکتا ہو[لے]" یہی بات میں وِن وڈ کے

لے The Limitations of Science, p. 9

مندرجہ بالا اعتراض کے بارے میں کہوں گا۔ ـــــ "بیسویں صدی کا ایک فلسفی آخر یہ سمجھنے کا کیا حق رکھتا ہے کہ خارجی دنیا کو اس کے اپنے مزعومات کے مطابق ہونا چاہیے"۔

مصنف کی سمجھ میں اتنی موٹی سی بات نہیں آئی کہ حقیقت واقعہ خارج کی محتاج نہیں ہوتی بلکہ خود خارج حقیقت واقعہ کا محتاج ہوتا ہے، جب حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے، اور اس کے سامنے حساب کتاب کے لئے ہمیں حاضر ہونا ہے تو پھر ہر شخص کو خواہ وہ روسو ہو یا ایک معمولی شہری، خدا کا وفادار بن کر زندگی گزارنی چاہیے، ہماری کامیابی حقیقت سے موافقت کرنے میں ہے نہ کہ اس کے خلاف چلنے میں، مصنف روسو اور گوئٹے سے یہ نہیں کہتا کہ وہ اپنے آپ کو حقیقت واقعہ کے مطابق بنائیں بلکہ خود حقیقت واقعہ سے چاہتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بدل ڈالے، اور جب وہ اپنے اندر تبدیلی کے لئے تیار نہیں ہوتی تو حقیقت واقعہ کو لغو قرار دیتا ہے، حالانکہ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی شخص جنگی راز کے تحفظ کے قانون کو اس بنا پر لغو قرار دے کہ اس کی رو سے بعض اوقات ایک معمولی سپاہی کا کام قابل تعریف قرار پاتا ہے، اور روزن برگ جیسے ممتاز سائنسداں اور اس کی نوجوان اور تعلیم یافتہ بیوی (Rosenberg Pair) کو بجلی کی کرسی پر بٹھا کر پھانسی دے دی جاتی ہے۔

ساری معلوم دنیا کے اندر صرف انسان ایک ایسا وجود ہے جو کل (Tomorrow) کا تصور رکھتا ہے، یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے کہ وہ مستقبل کے بارے میں سوچتا ہے اور اپنے آئندہ حالات کو بہتر بنانا چاہتا ہے، اس میں شک نہیں کہ بہت سے جانور بھی "کل" کے لئے عمل کرتے ہیں، مثلاً چونٹیاں گرمی کے موسم میں جاڑے کے لئے خوراک جمع کرتی ہیں یا بیا اپنے آئندہ پیدا ہونے والے بچوں کے لئے گھونسلا بناتا ہے، مگر جانوروں کا اس قسم کا عمل محض جبلت کے تحت غیر شعوری طور پر ہوتا ہے، وہ "کل" کی ضرورتوں کو سوچ کر بالقصد ایسا نہیں کرتے، بلکہ بلا ارادہ طبعی طور پر انجام دیتے ہیں، اور بطور نتیجہ وہ ان کے مستقبل میں انھیں کام آتا ہے "کل" کو ذہن میں رکھ کر اس کی خاطر سوچنے کے لئے تصوری فکر

(Conceptual Thought) کی ضرورت ہے، اور یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے کسی دوسرے جاندار کو تصوری فکر کی خصوصیت حاصل نہیں۔

انسان اور دوسری مخلوقات کا یہ فرق ظاہر کرتا ہے کہ انسان کو دوسری تمام چیزوں سے زیادہ مواقع ملنے چاہئیں، جانوروں کی زندگی صرف آج کی زندگی ہے، وہ زندگی کا کوئی "کل" نہیں رکھتے مگر انسان کا مطالعہ صاف طور پر بتاتا ہے کہ اس کے لئے ایک "کل" ہونا چاہیے، ایسا نہ ہونا نظام فطرت کے خلاف ہے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ موجودہ زندگی میں ہماری ناکامیاں، عام طور پر، ہم کو اس سے بہتر ایک زندگی کی توقع کی طرف لے جاتی ہیں، ایک خوش حال فضا میں ایسا عقیدہ باقی نہیں رہ سکتا، روم کے غلام ۔مثال کے طور پر، بہت بڑی تعداد میں عیسائی ہو گئے، کیونکہ عیسائیت ان کو آسمان میں خوشی حاصل ہونے کی توقع دلاتی تھی، یہ یقین کیا جاتا ہے کہ سائنس کی ترقی سے انسان کی خوشی اور خوشحالی بڑھے گی، اور بالآخر دوسری زندگی کا تصور ختم ہو جائے گا۔

مگر سائنس اور تکنالوجی کی چار سو سالہ تاریخ اس کی تصدیق نہیں کرتی، تکنالوجی کی ترقی نے سب سے پہلے دنیا کو جو چیز دی وہ یہ تھا کہ سرمایہ رکھنے والے محدود گروہ کو ایسے وسائل و ذرائع ہاتھ آگئے جس کے بل پر وہ چھوٹے کاریگروں اور پیشہ وروں کو ختم کرکے دولت کا تمام بہاؤ اپنی طرف کرلیں اور عام باشندوں کو محض اپنا محتاج مزدور بنا کر رکھ دیں، اس انجام کے ہولناک مناظر مارکس کی کتاب "کیپٹل" میں تفصیل کے ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں، جو گویا اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے اس مزدور طبقہ کی چیخ ہے، جس کو مشینی نظام نے اپنے ابتدائی دور میں جنم دیا تھا، اس کے بعد ردعمل شروع ہوا اور مزدور تحریکوں کی ایک صدی کی کوشش سے اب حالات بہت کچھ بدل چکے ہیں مگر یہ تبدیلی صرف ظاہر کی تبدیلی ہے، بیشک آج کا مزدور پہلے کے مزدور کے مقابلے میں زیادہ اجرت پاتا ہے، لیکن جہاں تک حقیقی خوشی کی دولت کا تعلق ہے، اس معاملے میں وہ اپنے پیش رووں

سے بھی زیادہ محروم ہے ۔۔۔ سائنس اور ٹکنالوجی نے جو نظام بنایا ہے، وہ کچھ مادی ظواہر انسان کو دے دے، مگر خوشی اور اطمینان قلب کی دولت پھر بھی اسے نہیں دیتا۔ تہذیب جدید کے انسان کے بارے میں بلیک (Blake) کے یہ الفاظ نہایت صحیح ہیں :۔

A mark in every face I meet,
Marks of weakness, marks of woe.

برٹرینڈ رسل نے اعتراف کیا ہے کہ "ہماری دنیا کے جانور خوش ہیں، انسانوں کو بھی خوش ہونا چاہئے، مگر جدید دنیا میں انھیں یہ نعمت حاصل نہیں۔"

Conquest of Happiness p. 11

بلکہ رسل کے الفاظ میں اب تو صورت حال یہ ہے کہ لوگ کہنے لگے ہیں کہ اس کا حصول ممکن ہی نہیں :۔

Happiness in the modern world
has become an impossibility
p. 93

نیویارک جانے والا ایک سیاح ایک طرف تو اسٹیٹ بلڈنگ جیسی عمارتوں کو دیکھتا ہے جس کی ۱۰۲ منزلیں ہیں اور جو اتنی اونچی ہے کہ اس کا اوپر کا ٹمپریچر نیچے کے مقابلے میں کافی سرد ہو جاتا ہے، اس کو دیکھ کر اتریں تو یہ مشکل ہی سے یقین آئے گا کہ آپ اس پر گئے تھے، ۱۲۵۰ فٹ بلند عمارت پر چڑھنے میں لفٹ کے ذریعہ صرف تین منٹ لگتے ہیں، ان عالی شان عمارتوں کو دیکھ کر وہ کلب میں جاتا ہے، وہاں وہ دیکھتا ہے کہ عورت مرد سب مل مل کر خوب ناچ رہے ہیں۔ "کتنے خوش نصیب ہیں یہ لوگ۔" وہ سوچتا ہے، مگر زیادہ دیر گزرنے نہیں پاتی کہ اس جھنڈ میں سے ایک نوجوان عورت آکر اس کے پاس کی نشست پر بیٹھ جاتی ہے، وہ بہت افسردہ ہے۔

"سیاح! کیا میں بہت بدصورت ہوں" عورت کہتی ہے۔

"میرا خیال تو ایسا نہیں ہے۔"

"مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھ میں رعنائی Glamour نہیں ہے۔"

"میرے خیال میں تو تم میں گلے مرہے۔"

"شکریہ۔ لیکن اب نہ مجھے نوجوان ٹیپ (Tap) کرتے ہیں اور نہ ڈیٹ (Date) مانگتے ہیں، مجھے زندگی ویران نظر آنے لگی ہے۔"

یہ جدید دور کے انسان کی ایک ہلکی سی جھلک ہے، حقیقت یہ ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے صرف مکانوں کو ترقی دی ہے اس نے مکینوں کے دل کا سکون چھین لیا ہے، اس نے شاندار مشینیں کھڑی کی ہیں مگر ان مشینوں میں کام کرنے والے انسانوں کو چین سے محروم کر دیا ہے، یہ سائنس اور ٹکنالوجی کی ۲۰۰ سو سالہ تاریخ کا آخری انجام ہے، پھر کس بنیاد پر یقین کر لیا جائے کہ سائنس اور ٹکنالوجی وہ سکون اور مسرت کی دنیا بنانے میں کامیاب ہوگی جس کی انسان کو تلاش ہے۔

۲۔ اب اخلاقی تقاضے کو لیجئے، اس حیثیت سے جب ہم دیکھتے ہیں تو دنیا کے حالات شدید طور پر اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ اس کی ایک آخرت ہو، اس کے بغیر ساری تاریخ بالکل بے معنی معلوم ہوتی ہے۔

یہ ہمارا ایک فطری احساس ہے کہ ہم خیر اور شر، ظلم اور انصاف میں تمیز کرتے ہیں، انسان کے سوا کسی بھی مخلوق کے اندر یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی، مگر انسان ہی کی دنیا وہ دنیا ہے، جہاں اس احساس کو سب سے زیادہ پامال کیا جا رہا ہے، انسان اپنے ابنائے نوع پر ظلم کرتا ہے، وہ اس کو لوٹتا ہے، اس کو قتل کرتا ہے، اور طرح طرح سے اس کو تکلیف پہنچاتا ہے، حالانکہ جانوروں تک کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی نوع کے ساتھ سفاکی نہیں کرتے، بھیڑیے اور شیر اپنی نوع کے لئے بھیڑیے اور شیر نہیں ہیں، مگر انسان خود انسان کے لئے بھیڑیا بنا ہوا ہے، بیشک انسانی تاریخ میں حق شناسی کی چنگاریاں بھی ملتی ہیں اور وہ بہت قابل قدر ہیں، مگر اس کا بڑا حصہ حق تلفی کی روداد سے بھرا ہوا ہے، مورخ کو بڑی مایوسی ہوتی ہے، جب وہ دیکھتا ہے کہ انسان کا ضمیر جو کچھ چاہتا ہے، دنیا کے واقعی حالات اس کے خلاف ہیں، یہاں میں چند اقوال نقل کروں گا۔

والٹیر:۔ "انسانی تاریخ محض جرائم اور مصائب کی ایک تصویر ہے" [۱]

ہربرٹ اسپنسر:۔ "تاریخ محض بے فائدہ گپ ہے"

نپولین:۔ "تاریخ تمام کی تمام لایعنی قصے کا نام ہے"

اڈورڈ گبن:۔ "انسانیت کی تاریخ جرائم، حماقت اور بدقسمتی کے رجسٹر سے کچھ ہی زیادہ ہے"

ہیگل:۔ "پبلک اور حکومت نے تاریخ کے مطالعہ سے جو واحد چیز سیکھی ہے، وہ صرف یہ کہ انھوں نے تاریخ سے کچھ نہیں سیکھا"

Western Civilisation by Edward McNall Burns, p. 871

کیا انسانیت کا یہ عظیم الشان ڈراما اسی لئے کھیلا گیا تھا کہ وہ اس طرح کی ایک ہولناک کہانی وجود میں لا کر ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے، ہماری فطرت جواب دیتی ہے کہ نہیں، انسان کے اندر عدل وانصاف کا احساس تقاضا کرتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا، اور نہ ایسا ہونا چاہئے، ایک دن ایسا آنا ضروری ہے، جب حق اور ناحق الگ ہو، ظالم کو اس کے ظلم کا اور مظلوم کو اس کی مظلومیت کا بدلہ ملے، یہ ایک ایسی طلب ہے، جس کو اسی طرح تاریخ سے الگ نہیں کیا جا سکتا جس طرح اسے انسان سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

فطرت اور واقعہ کا یہ تضاد بتاتا ہے کہ اس خلا کو لازماً پر ہونا چاہئے — جو کچھ ہو رہا ہے، اور جو کچھ ہونا چاہئے، دونوں کا فرق ثابت کرتا ہے کہ ابھی زندگی کے ظہور کا کوئی اور اسٹیج باقی ہے، یہ خلا پکار رہا ہے کہ ایک وقت ایسا ہونا چاہئے جب دنیا کی تکمیل ہو، مجھے حیرت ہے کہ لوگ ہارڈی کے فلسفہ پر ایمان لا کر دنیا کو ظلم اور بے رحمی کی جگہ سمجھنے لگتے ہیں، مگر یہی ظالمانہ صورتِ حال انھیں اس یقین کی طرف نہیں لے جاتی کہ جو کچھ آج موجود نہیں ہے، مگر عقل جس کا تقاضا کرتی ہے، اسے کل وقوع میں آنا چاہئے۔

"قیامت نہ ہو تو ان ظالموں کا سر کون توڑے" — یہ فقرہ اکثر ایک دردناک آہ کے ساتھ اس وقت

---

[۱] *Story of Philosophy* by Will Durant, p. 220

میری زبان سے نکل جاتا ہے، جب میں اخبار پڑھتا ہوں، اخبار گویا دنیا کے روزانہ حالات کی ایک تصویر ہے، مگر اخبار ہمیں دنیا کے حالات کے بارے میں کیا بتاتے ہیں، وہ اغوا اور قتل کی خبریں دیتے ہیں، چوری اور الزام تراشی کی داستانیں سناتے ہیں، سیاسی تجارت اور تاجرانہ سیاست کے جھوٹے پروپیگنڈے ہمارے دماغوں میں بھرتے ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ فلاں حکمراں نے اپنے ماتحت کمزوروں کو دبا لیا، فلاں قوم نے قومی مفاد کے لئے فلاں علاقے پر قبضہ کرلیا، غرض اخبار، درویش اور سلطان کی عیاریوں کی داستان کے سوا اور کچھ نہیں، اور مستقبل قریب میں ہندوستان میں ہونے والے حادثات خاص طور پر جبل پور، کلکتہ، جمشید پور اور راورکیلا کی قتل وغارت گری کے بعد تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں کسی بھی قابل قیاس یا ناقابل قیاس بدترین برائی کو ناممکن نہیں سمجھنا چاہئے، ایک قوم سیکولرزم، جمہوریت اور اہنسا کی علمبردار بن کر وحشیانہ فرقہ واریت، سفاکانہ آمریت اور بدترین تشدد کا ارتکاب کرسکتی ہے، ایک لیڈر جس کو محسن انسانیت اور پیغمبر امن واماں کا خطاب دیا گیا ہو عین اس کے اقتدار میں انسانیت کے اوپر ایسے شرمناک مظالم کئے جاسکتے ہیں، جن سے چیتے اور بھیڑیے اور جنگلی سور بھی پناہ مانگیں، حتیٰ کہ نشر واشاعت کے اس دور میں یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا کے ایک بہت بڑے ملک میں بہت بڑے پیمانے پر کھلم کھلا ایک گروہ کو لوٹنے، جلانے اور قتل کرنے کے انتہائی بھیانک واقعات نہایت منظم طریقے پر ہفتوں اور مہینوں اور سالوں ہوتے رہیں، مگر اس کے باوجود دنیا کا پریس ان سے بے خبر ہو اور تاریخ کے صفحات سے وہ اس طرح محو ہو جائیں گویا کچھ ہوا ہی نہیں ــــ کیا یہ دنیا اسی لئے بنائی گئی تھی کہ مکاری، شیطنت، درندگی اور ڈاکہ زنی کے ان ہولناک ڈراموں کا بس ایک اسٹیج بن کر رہ جائے اور اس کے بعد نہ ظالم کے لئے کچھ ہو اور نہ مظلوم کے لئے کچھ ــــ حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسی دنیا خود اپنے سارے وجود کے ساتھ اس بات کا اعلان ہے کہ وہ نامکمل ہے، اور اس کا نامکمل ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک وقت آنا چاہئے جب وہ مکمل کی جائے۔

اس بات کو ایک اور پہلو سے دیکھئے، قدیم ترین زمانے سے انسان کے سامنے یہ مسئلہ رہا ہے کہ

لوگوں کو حق و صداقت کی راہ پر کیسے قائم رکھا جائے، اگر اس مقصد کے لئے تمام افراد کے مقابلے میں کچھ لوگوں کو سیاسی اختیار دیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ ان کے ماتحت ان کی گرفت کے خوف سے زیادتیاں نہ کریں ــــ مگر اس تدبیر میں خود ان صاحب اختیار افراد کو عدل پر قائم رکھنے کا کوئی محرک موجود نہیں ہے، اگر اس مقصد کے لئے قانون بنایا جائے اور پولیس کا محکمہ قائم ہو تو ان مقامات اور مواقع پر آدمی کو کون کنٹرول کرے جہاں پولیس اور قانون نہیں پہونچتے اور نہیں پہونچ سکتے، اگر اپیل اور پروپیگنڈے کی مہم چلائی جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ محض کسی کی اپیل کی بنا پر کوئی شخص اپنے ملتے ہوئے فائدے کو کیوں چھوڑ دے گا، دنیا کی سزا کا خوف بدعنوانیوں کو ہرگز روک نہیں سکتا، کیونکہ ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ جھوٹ، رشوت، سفارش، اثرات کا ناجائز استعمال اور اسی قسم کے دوسرے بہت سے ذرائع موجود ہیں جو سزا کے ہر امکان کو یقینی طور پر ختم کر سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی ایسا محرک ہی بدعنوانیوں کو روکنے میں کارگر ہو سکتا ہے جو انسان کے اپنے اندر موجود ہو، جو انسان کے اپنے ارادے میں شامل ہو جائے خارجی محرک کبھی اس معاملے میں کامیاب نہیں ہو سکتا، اور یہ بات صرف آخرت کے تصور میں ممکن ہے، آخرت کے نظریے میں ایک ایسا محرک موجود ہے جو بدعنوانیوں سے بچنے کے مسئلے کو ہر شخص کا اپنا مسئلہ بنا دیتا ہے، وہ ہر شخص کے لئے یکساں اہمیت رکھتا ہے، خواہ وہ ماتحت ہو یا افسر، اندھیرے میں ہو یا اجالے میں، ہر شخص یہ سوچنے لگتا ہے کہ اسے خدا کے یہاں جانا ہے، اور ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے، اور اس سے لازماً باز پرس کرے گا، مذہبی عقیدے کی اسی اہمیت کی بنا پر سترھویں صدی کے آخر کے ایک نامور جج میتھو ہیل (Mathew Halos) نے کہا ہے:۔

"یہ کہنا کہ مذہب ایک فریب ہے، ان تمام ذمہ داریوں اور پابندیوں کو منسوخ کرنا ہے جن سے سماجی نظم کو برقرار رکھا جاتا ہے۔"

Religion without Revelation, p. 115

نظریۂ آخرت کا یہ پہلو کتنا اہم ہے، اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ بہت سے لوگ جو خدا پر یقین نہیں رکھتے، جو اس بات کو بطور ایک حقیقت واقعہ نہیں مانتے کہ کوئی فیصلہ کا دن آنے والا ہے، وہ بھی تاریخ کے تجربے کی بنا پر ماننے پر مجبور ہوئے ہیں کہ اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے، جو انسان کو قابو میں رکھ سکتی ہو اور ہر حال میں اس کو عدل وانصاف کی روش پر قائم رہنے کے لئے مجبور کر سکے، مشہور جرمن فلسفی کانٹ نے خدا کے تصور کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ اس کی موجودگی کا کوئی تسلی بخش ثبوت ہم کو نہیں ملتا، اس کے نزدیک نظری معقولیت (Theoretical Reason) تو یقیناً مذہب کے حق میں نہیں ہے، مگر اخلاقی پہلو سے مذہب کی عملی معقولیت (Practical Reason) کو وہ تسلیم کرتا ہے[1]، والٹیر (Voltaire) کسی مابعد الطبیعی حقیقت کو نہیں مانتا، مگر اس کے نزدیک:

"خدا اور دوسری زندگی کے تصور کی اہمیت اس لحاظ سے بہت زیادہ ہے کہ وہ اخلاقیات کے لئے مفروضے (Postulates of the Moral Feeling) کا کام دیتے ہیں، اس کے نزدیک صرف اسی کے ذریعہ سے بہتر اخلاق کی فضا پیدا کی جا سکتی ہے، اگر یہ عقیدہ ختم ہو جائے تو حسن عمل کے لئے کوئی محرک باقی نہیں رہتا، اور اس طرح سماجی نظم کا برقرار رہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔"

(*History of Philosophy* by Windelband, p. 496

جو لوگ آخرت کو ایک فرضی تصور کہتے ہیں ان کو سوچنا چاہئے کہ آخرت اگر فرضی ہے تو ہمارے لئے اس قدر ضروری کیوں ہے، کیوں ایسا ہے کہ اس کے بغیر ہم صحیح معنوں میں کوئی سماجی نظام بنا ہی نہیں سکتے، انسانی ذہن سے اس تصور کو نکالنے کے بعد کیوں ہماری ساری زندگی ابتر ہو جاتی ہے، کیا کوئی فرضی چیز زندگی کے لئے اس قدر ناگزیر ہو سکتی ہے، کیا اس کائنات میں ایسی کوئی مثال پائی جاتی ہے، کہ ایک چیز حقیقت میں موجود نہ ہو مگر اس کے باوجود وہ اس قدر حقیقی بن جائے، زندگی سے اس کا کوئی

[1] *Story of Philosophy*, N. Y. 1954, p. 279

تعلق نہ ہو، مگر اس کے باوجود وہ زندگی سے اتنی متعلق نظر آئے، زندگی کی صحیح اور منصفانہ تنظیم کے لئے آخرت کے تصور کا اس قدر ضروری ہونا خود یہ ظاہر کرتا ہے کہ آخرت اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے، بلکہ اگر میں یہ کہوں تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ تصور آخرت کے حق میں استدلال کا یہ ایک ایسا پہلو ہے، جو اس نظریے کو لیبارٹری ٹسٹ کے معیار پر صحیح ثابت کر رہا ہے۔

۳۔ اب ایک اور پہلو سے دیکھئے، جس کو میں "کائناتی تقاضا" کہتا ہوں، پچھلے باب میں میں نے کائنات میں خدا کے وجود پر بحث کی ہے، اس سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ عین علمی اور عقلی مطالعہ ہی کا یہ تقاضا ہے کہ ہم اس کائنات کا ایک خدا مانیں، اب اگر اس دنیا کا کوئی خدا ہے تو یقیناً بندوں کے ساتھ اس کے تعلق کو ظاہر ہونا چاہیے، یہ کب ظاہر ہوگا، جہاں تک موجودہ دنیا کا معاملہ ہے، یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے، کہ آج یہ تعلق ظاہر نہیں ہو رہا ہے، آج جو شخص خدا کا منکر ہے، اور کھلے عام یہ اعلان کرتا ہے کہ "میں خدا سے نہیں ڈرتا" اس کو لیڈری اور حکومت حاصل ہو جاتی ہے، اس کے برعکس جو خدا کے بندے خدا کا کام کرنے کے لئے اٹھتے ہیں، ان کی سرگرمیوں کو وقت کا اقتدار غیر قانونی قرار دے دیتا ہے، جو لوگ خدا کا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "ہمارا راکٹ چاند تک گیا اور راستہ میں اس کو کہیں خدا نہیں ملا۔" ان کے نظریات کو پھیلانے کے لئے بے شمار ادارے کام کر رہے ہیں، اور پورے پورے ملکوں کے ذرائع و وسائل ان کی خدمت کے لئے وقف ہیں، اور جو لوگ خدا اور مذہب کی بات پیش کر رہے ہیں، ان کو تمام ماہرین اور علمائے وقت رجعت پسند اور ماضی کے اندھیرے میں بھٹکنے والا کہہ کر رد کر دیتے ہیں، لوگ پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں، قومیں بنتی ہیں اور بگڑتی ہیں، انقلابات آتے ہیں، اور چلے جاتے ہیں، سورج نکلتا ہے، اور ڈوب جاتا ہے، مگر خدا کی خدائی کا کہیں ظہور نہیں ہوتا، ایسی حالت میں سوال یہ ہے کہ ہم خدا کو مانتے ہیں یا نہیں، اگر ہم خدا کو مانتے ہیں تو ہمیں آخرت کو بھی ماننا پڑے گا، کیونکہ خدا اور بندوں کا تعلق ظاہر ہونے کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں۔

ڈارون اس دنیا کا ایک خالق (Creator) تسلیم کرتا ہے، مگر اس نے زندگی کی جو تشریح کی ہے، اس کے اندر خالق اور مخلوق کے درمیان کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا اور نہ کائنات کے کسی ایسے انجام کی ضرورت معلوم ہوتی ہے، جہاں یہ تعلق ظاہر ہو، مجھے نہیں معلوم کہ ڈارون اپنے حیاتیاتی نقطۂ نظر کے اس خلا کو کیسے پُر کرے گا مگر میری عقل کو یہ بات نہایت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا تو ہو مگر دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو اور بندوں کے مقابلے میں اس کی جو مالکانہ حیثیت ہے، وہ کبھی سامنے نہ آئے، اتنی بڑی کائنات پیدا ہو کر ختم ہو جائے اور یہ ظاہر نہ ہو کہ اس کے وجود میں آنے کا مقصد کیا تھا، اور جس نے اسے بنایا تھا، وہ کس قسم کی صفات رکھنے والی ہستی تھا

حقیقت یہ ہے کہ اگر معقولیت کے ساتھ غور کیا جائے گا تو دل پکار اٹھے گا کہ بے شک آخرت آنے والی ہے، بلکہ وہ آپ کو بالکل آتی ہوئی نظر آئے گی، آپ دیکھیں گے کہ حاملہ کے پیٹ میں جس طرح اس کا حمل باہر آنے کے لئے بیتاب ہو، اسی طرح وہ کائنات کے اندر بوجھل ہو رہی ہے اور قریب ہے کہ کسی بھی صبح و شام وہ انسانوں کے اوپر پھٹ پڑے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ؕ	یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ کہاں ہے قیامت کہو اس کا
قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا	علم تو صرف خدا کو ہے، وہی اپنے وقت پر اس کو ظاہر
لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ؔ ۚ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ	کرے گا، وہ زمین و آسمان میں بوجھل ہو رہی ہے
وَالْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ (اعراف ۱۸۷)	وہ بالکل اچانک تم پر آ پڑے گی۔

تجرباتی شہادت

اب ہم اس بحث کے آخری جزو پر آتے ہیں "کیا کوئی تجرباتی شہادت اس بات کی موجود ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی ہے" اس کا جواب یہ ہے کہ ہماری پہلی زندگی خود اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے، جو لوگ دوسری

زندگی کے منکر ہیں، وہ یقینی طور پر پہلی زندگی کا اقرار کر رہے ہیں، پھر جو زندگی ایک بار ممکن ہے، وہ دوسری بار کیوں ظہور میں نہیں آسکتی، ایک تجربہ جس سے آج ہم دوچار ہیں، وہی تجربہ اگر دوبارہ ہمارے ساتھ پیش آئے تو اس میں استحالہ کی کون سی بات ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات میں اس سے زیادہ خلاف عقل بات اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ ایک واقعہ کو آپ حال میں تسلیم کریں مگر مستقبل کے لئے اسی واقعہ کا انکار کردیں۔

یہ موجودہ انسان کا عجیب تضاد ہے کہ کائنات کی توجیہہ کے لئے خود اس نے جو "خدا گڑھے ہیں" ان کے بارے میں تو وہ پورے یقین کے ساتھ اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ وہ واقعات کو دوبارہ پیدا کرسکتے ہیں، مگر مذہب جس خدا کا تصور پیش کرتا ہے، اس کے متعلق اسے یہ تسلیم نہیں ہے کہ وہ واقعات کو دوبارہ وجود میں لے آئے گا، جیمز جینز یہ بتاتے ہوئے کہ موجودہ زمین اور اس کے تمام مظاہر ایک "حادثہ" کے پیدا کردہ ہیں، اس نظریے کے حامیوں کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

"اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، اگر ہماری زمین محض کچھ حادثات کے نتیجے میں وجود میں آئی ہو اگر کائنات اسی طرح لمبی مدت تک قائم رہے تو کسی بھی قابل قیاس حادثے کا وقوع میں آنا ممکن ہے۔"

Modern Scientific Thought, p. 3

نظریۂ ارتقا کا دعویٰ ہے کہ حیوانات کی مختلف نوعیں ایک ہی ابتدائی نوع سے ترقی کرکے وجود میں آئی ہیں، چنانچہ ڈارون کی تشریح کے مطابق موجودہ زرافہ ابتداً دوسرے سم دار چوپایوں کی مانند تھا، مگر توالد و تناسل کے طویل عمل کے درمیان چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں Variations کے جمع ہونے سے بالآخر وہ غیر معمولی طور پر ایک لمبا ڈھانچہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا، اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ اپنی کتاب کے ساتویں باب میں لکھتا ہے:

"میرے نزدیک یہ تقریباً یقینی ہے کہ (اگر لمبی مدت تک مطلوبہ عمل جاری رہے تو) ایک معمولی سم دار چوپائے کو زرافہ کی صورت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔"

Origin of Species, p. 169

اسی طرح جس نے بھی زندگی اور کائنات کی کوئی توجیہہ کی ہے، بالکل فطری طور پر اس کو یہ بھی ماننا پڑا ہے کہ جن حالات کی موجودگی کو وہ زندگی اور کائنات کا سبب قرار دیتا ہے، وہی حالات اگر دوبارہ فراہم ہوسکیں تو یقیناً یہی واقعات دوبارہ وجود میں آسکتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ عقلی طور پر دوسری زندگی کا امکان اتنا ہی ہے جتنا پہلی زندگی کا، کائنات کا جو خالق بھی ہم تسلیم کریں، ہم کو ماننا پڑے گا کہ وہ خالق انھیں واقعات کو دوبارہ وجود میں لا سکتا ہے، جس کو اس نے ایک بار پیدا کیا ہے، اس اعتراف سے ہم صرف اسی صورت میں بچ سکتے ہیں، جبکہ ہم پہلی زندگی کا انکار کردیں، پہلی زندگی کو مان لینے کے بعد ہمارے پاس دوسری زندگی کو نہ ماننے کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی۔

۲۔ نفسیاتی تحقیق، جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، اس کے مطابق لاشعور یا دوسرے لفظوں میں انسان کے حافظے کے خانے میں اس کے تمام خیالات ہمیشہ کے لئے محفوظ رہتے ہیں، یہ واقعہ صریح طور پر ثابت کرتا ہے کہ انسان کا ذہن اس کے جسم کا حصہ نہیں ہے، جسم کا یہ حال ہے کہ اس کے ذرات ہر چند سال بعد بالکل بدل جاتے ہیں، لیکن لاشعور کے دفتر میں سو برس بعد بھی کوئی تغیر، کوئی دھندلاپن، کوئی مغالطہ یا شبہ پیدا نہیں ہوتا، اگر یہ دفتر حافظہ جسم سے متعلق ہے تو وہ کہاں رہتا ہے، جسم کے کس حصے میں ہے، اور جسم کے ذرات جب چند سال بعد غائب ہوجاتے ہیں تو وہ غائب کیوں نہیں ہوتا، یہ کون سا ریکارڈ ہے کہ ریکارڈ کی تختی ٹوٹ کر ختم ہوجاتی ہے، مگر وہ ختم نہیں ہوتا، جدید نفسیات کا یہ مطالعہ صریح طور پر ثابت کرتا ہے کہ انسانی وجود حقیقتہً اس جسم کا نام نہیں ہے، جس پر گھساؤ اور موت کا عمل طاری ہوتا ہے، بلکہ اس کے علاوہ اس کے اندر ایک چیز ہے، جس کے لئے فنا نہیں ہے، اور جو زوال میں مبتلا ہوئے بغیر اپنے وجود کو مستقل طور پر یکساں حال میں باقی رکھتا ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فاصلہ اور وقت کے قوانین صرف ہماری موجودہ دنیا کے اندر رائج ہیں، اور اگر موت کے بعد کوئی اور دنیا ہے تو وہ ان قوانین کے دائرہ عمل سے باہر ہے، موجودہ زندگی میں ہمارا

ہر شعوری فعل وقت اور فاصلہ کے قوانین کے مطابق سرزد ہوتا ہے، لیکن اگر فرائڈ کے نظریے کے مطابق ہماری کوئی ذہنی زندگی ایسی ہے جو ان قوانین کی پابندی سے آزاد ہے تو اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ ہماری یہ زندگی موت کے بعد بھی جاری رہے گی، ہم موت کے بعد بھی زندہ رہیں گے، ہماری موت خود فاصلہ اور وقت کے قوانین کے عمل کا نتیجہ ہے، چونکہ ہماری اصل ہستی یا فرائڈ کے الفاظ میں ہمارا لاشعور ان قوانین کے عمل سے آزاد ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ موت اس پر وارد نہیں ہوتی، بلکہ صرف جسدِ عنصری پر وارد ہوتی ہے، لاشعور جو اصل انسان ہے، وہ اس کے بعد بھی باقی رہتا ہے ـــــ مثلاً ایک واقعہ جو ۲۰ سال پہلے گزرا تھا ـــــ یا ایک خیال جو میرے ذہن میں ۲۰ سال پہلے آیا تھا، اور اب میں اسے بالکل بھول چکا تھا، اس کو آج میں خواب میں دیکھتا ہوں، نفسیاتی نقطہ نظر سے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ میرے حافظہ (لاشعور) کے خانے میں بجنسہ موجود تھا، اب سوال یہ ہے کہ یہ حافظہ کہاں ہے؟ اگر وہ خلیوں کے اوپر ثبت تھا جیسے گراموفون کے ریکارڈ کے اوپر آواز ثبت رہتی ہے، تو وہ خلیے جو ۲۵ سال پہلے ان خیالات کا ریکارڈ بنے تھے، وہ بہت پہلے ٹوٹ کر اور مردہ ہو کر میرے جسم سے نکل گئے، اب نہ ان خلیوں کا بحیثیت خلیہ کہیں وجود ہے، اور نہ میرا ان سے کوئی تعلق ہے، پھر یہ خیال میرے جسم کے کس مقام پر تھا، یہ ایک تجرباتی شہادت اس بات کی ہے کہ جسم کے ماورا ایک اور دنیا ہے، جو بذاتِ خود اپنا وجود رکھتی ہے، جو جسم کے ختم ہونے سے ختم نہیں ہوتی۔

۳۔ اسی طرح سائیکیکل تحقیقات (Psychical Research) کے نتائج جو سامنے آئے ہیں، وہ بھی خالص تجرباتی اور مشاہداتی سطح پر موت کے بعد زندگی کے وجود کو ثابت کرتے ہیں، اس میں ہمارے نقطۂ نظر سے مزید دلچسپی کی بات یہ ہے کہ یہ بقائے محض کو ثابت نہیں کرتے، بلکہ عین اس شخصیت کی بقا کو ثابت کرتے ہیں، جس سے ہم موت سے پہلے واقف تھے۔

انسان کی بہت سی ایسی خصوصیات ہیں جو بذاتِ خود تو پہلے سے موجود تھیں مگر ان پر سائنسی انداز سے غور و فکر نہیں ہوا تھا، مثلاً خواب دیکھنا انسان کی قدیم ترین خصوصیت ہے، مگر جدید دور میں خواب کے

مطالعہ سے جو نفسیاتی حقائق معلوم کئے گئے ہیں، ان سے قدیم دور کے لوگ ناآشنا تھے، اسی طرح کچھ اور مظاہر ہیں، جن کے متعلق موجودہ زمانے میں باقاعدہ اعداد و شمار جمع کئے گئے اور سائنسی انداز سے ان کا تجزیہ کیا گیا، اس طرح جدید مطالعہ کے ذریعہ ان واقعات سے نہایت اہم نتائج برآمد ہوئے ہیں، اسی میں سے ایک سائیکیکل ریسرچ ہے، جو جدید نفسیات کی ایک شاخ ہے، اور جس کا مقصد انسان کی مافوق العادت صلاحیتوں کا تجرباتی مطالعہ ہے، اس قسم کی تحقیقات کے لئے سب سے پہلا ادارہ ۱۸۸۲ء میں انگلینڈ میں قائم ہوا اور ۱۸۸۹ء میں اس نے سترہ ہزار اشخاص سے رابطہ قائم کرکے وسیع پیمانے پر اپنی تحقیقات شروع کردیں، یہ اب بھی مطالعۂ نفسیات کا ادارہ (Society for Psychical Research) کے نام سے موجود ہے، اور اسی نوعیت کے دوسرے ادارے دوسرے ملکوں میں کام کر رہے ہیں، ان اداروں نے مختلف مظاہروں اور تجربات کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی شخصیت کسی پراسرار شکل میں باقی رہتی ہے۔

ایک سفری ایجنٹ مسوری (امریکہ) میں سینٹ جوزف ہوٹل کے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا اپنے آڈر نوٹ کر رہا تھا کہ "یکایک" وہ لکھتا ہے" مجھے احساس ہوا کہ میرے دائیں جانب کوئی بیٹھا ہوا ہے، میں نے تیزی سے مڑ کر دیکھا تو صاف طور پر مجھے نظر آیا کہ وہ میری بہن ہے" اس کی یہ بہن ۹ سال پہلے مر چکی تھی، کچھ دیر بعد بہن کا یہ پیکر اس کے سامنے سے غائب ہوگیا، مگر اس واقعہ سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ اپنا سفر جاری رکھنے کے بجائے وہ دوسری ٹرین سے اپنے وطن سینٹ لوئی (St. Louis) واپس ہوگیا، گھر آکر اس نے واقعہ کی پوری تفصیل اپنے اعزہ کو بتائی، جب وہ کہتے کہتے اس جملہ پر پہنچا کہ "میں نے بہن کے چہرے کے دائیں طرف سرخ رنگ کی ایک روشن خراش دیکھی" تو اس کی ماں یکایک کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ کھڑی ہوگئی اور اس نے بتایا کہ لڑکی کی موت کے بعد ایک اتفاقی سبب سے مجھ سے یہ خراش اس کے چہرے پر پڑ گئی تھی، اس بدنمائی کا مجھے سخت احساس ہوا، اور فوراً پاؤڈر لگا کر میں نے خراش کے تمام آثار اس کے چہرے سے مٹادیئے

اور پھر کبھی کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا۔[1]

Human Personality and its survival of Bodily Death,
by F.W.H. Myers (N.Y. 1930, Vol. II p. 27-30)

اس طرح کے اور بہت سے واقعات ہیں، جو مرنے کے بعد شخصیتوں کی موجودگی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں، اس طرح کے واقعات کو وہم وخیال نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ چہرے کی خراش کا علم یا توماں کو تھا یا مردہ لڑکی کو، تیسرا کوئی بھی شخص اس کو قطعاً نہیں جانتا تھا۔

دوسرے قسم کے واقعات جو زندگی بعد موت کا تجرباتی ثبوت فراہم کرتے ہیں، وہ ایسے لوگ ہیں، جن کو خودکار (Automatists) کہا جاتا ہے، یہ وہ مرد یا عورتیں ہیں، جن سے ایسے افعال ظاہر ہوتے ہیں، جو یہ ثابت کرتے ہیں، کہ کسی مرنے والے کی روح اس کے اندر رہتی ہے، ایسا شخص اپنے تجربہ کرنے والے کے سامنے چند ایسے جزئی واقعات پیش کرتا ہے، جن کو صرف ایک مرا ہوا آدمی جانتا ہے، اور جو چند دن بعد صحیح ثابت ہوتے ہیں، اسی طرح مثلاً دیکھا جاتا ہے کہ وہ کسی شخص سے بات کر رہا ہے، اور اسی کے ساتھ ہاتھ میں پنسل لئے ہوئے بالکل دوسرے موضوع پر لکھ رہا ہے، جس کے مضمون کی اسے خود بھی اس وقت تک اطلاع نہیں ہوتی جب تک کہ وہ لکھنے کے بعد اسے پڑھ نہ لے، گویا اس کے اندر اس کے سوا کوئی اور شخصیت ہے، جو اس کے ہاتھ سے لکھوا رہی ہے۔

---

[1] اس طرح کے واقعات محض یورپ اور امریکہ کی خصوصیات نہیں ہیں، بلکہ دنیا کی ہر آبادی میں اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں چونکہ موجودہ زمانے کی بیشتر تحقیقات یورپ اور امریکہ ہی کے جغرافیہ میں ہوئی ہیں، اس لئے علمی شہادتوں کے سلسلے میں عموماً انھیں کا ذکر آتا ہے، اگر کچھ باحوصلہ لوگ ہمارے علاقے میں اس کام کو شروع کریں تو کثرت سے نہایت معتبر اور قوی شہادتیں فراہم ہوسکتی ہیں، مجھے ذاتی طور پر خود بھی بعض ایسے واقعات کا علم ہے جو اس سلسلے میں نہایت حیرت انگیز شہادت فراہم کرتے ہیں — افسوس ہماری قوم میں نہ تو کسی کو اس طرح کے کاموں میں سرمایہ لگانے کا جذبہ ہے اور نہ اپنا وقت دینے کا۔

A Philosophical Scrutiny of Religion, p. 407-10

اس استدلال کو قبول کرنے میں بہت سے جدید ذہنوں کو تامل ہے، سی، ڈی، براڈ (C.D. Broad) لکھتا ہے۔

"سائیکیکل ریسرچ کے مشتبہ استثناء کے علاوہ سائنس کی مختلف شاخوں میں سے کوئی شاخ زندگی بعد موت کا ادنیٰ امکان بھی ثابت نہیں کرتی۔"

Religion Philosophy and Psychical Research
London 1953, p. 235

مگر یہ استدلال ایسا ہی ہے، جیسے کہا جائے کہ "سوچنا" ایک مشتبہ فعل ہے، کیونکہ انسان کے سوا کوئی ایسا وجود اس کائنات میں ہمارے تجربے میں نہیں آیا جو "سوچنے" کے مظہر کی تصدیق کرتا ہو، ظاہر ہے کہ زندگی کا باقی رہنا یا باقی نہ رہنا ایک نفسیاتی مسئلہ ہے، اس لئے نفسیات ہی سے اس کا ثبوت یا عدم ثبوت ملے گا، کسی اور سائنس میں اس کی تصدیق ڈھونڈنا ایسا ہی ہے، جیسے سوچنے کے فطری مظہر کو سمجھنے کے لئے نباتات اور فلزیات سے تصدیق طلب کی جائے، یہی نہیں بلکہ خود انسان کے جسمانی حصے کے مطالعہ کو بھی اس کی تصدیق یا تردید کے لئے بنیاد بنایا نہیں جا سکتا کیونکہ جس چیز کی بقا کا دعویٰ کیا گیا ہے، وہ موجودہ مادی جسم نہیں، بلکہ وہ روح ہے، جو جسم سے ماسوا جسم کے اندر موجود رہتی ہے۔

چنانچہ دوسرے بہت سے علماء جنھوں نے ان شواہد کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا ہے، وہ زندگی بعد موت کو بطور واقعہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں براؤن یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر سی، جے، ڈوکاس (C.J. Ducasse) نے اپنی کتاب کے سترھویں باب میں زندگی بعد موت کے تصور کا فلسفیانہ اور نفسیاتی جائزہ لیا ہے، پروفیسر موصوف اگرچہ مذہب کے معنوں میں اخروی زندگی کے تصور پر عقیدہ نہیں رکھتے، مگر ان کا خیال ہے کہ ایسے شواہد موجود ہیں کہ مذہب کے عقیدے سے الگ کر کے زندگی کے بقا کو ہمیں ماننا

پڑتا ہے، اس باب کے آخری حصے میں وہ سائیکیکل ریسرچ کی تحقیقات کا جائزہ لینے کے بعد لکھتے ہیں۔

"کچھ بہت ہی ذہین اور نہایت ذی علم افراد جنھوں نے سالہا سال تک نہایت تنقیدی نظر سے متعلقہ شہادتوں کا مطالعہ کیا ہے، وہ بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کم از کم کچھ شواہد ایسے ضرور ہیں، جن میں صرف بقائے روح کا فریضہ (Survival Hypothesis) ہی معقول اور ممکن نظر آتا ہے، ان کی دوسری کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی، اس فہرست کے انتہائی نمایاں افراد میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

الفرڈ رسل ویلس (Alfred Russel Wallace)

سر ولیم کروکس (Sir William Crookes)

ایف، ڈبلیو، ایچ، میرس (F.W.H. Myers)

کیسر لومبراسو (Cesare Lombroso)

کیمل فلیمیرین (Camille Flammarion)

سر اولیور لاج (Sir Oliver Lodge)

ڈاکٹر رچرڈ ہاگسن (Dr. Richard Hodgson)

مسز ہنری سڈوک (Mrs Henry Sidgwick)

پروفیسر ہسلوپ (Professor Hyslop)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کے بعد زندگی کا عقیدہ جس کو بہت سے لوگ مذہبی طور پر مانتے ہیں، نہ صرف یہ کہ صحیح ہو سکتا ہے بلکہ شاید وہ ایک ایسا عقیدہ ہے، جس کو تجرباتی دلیل (Empirical Proof) سے ثابت کیا جا سکتا ہے، اور اگر ایسا ہے تو قطع نظر اس سے کہ وہ حقیقت کے جو زندگی بعد موت کی نوعیت کے متعلق اہل مذاہب نے فرض کر لی ہے،

قطعی معلومات بالآخر اس کے بارے میں حاصل ہو سکیں گی، مگر ایسی صورت میں اس کی مذہبی نوعیت کو ماننا ضروری نہیں ہوگا۔"

A Philosophical Scrutiny of Religion. p. 412

یہاں تک پہونچنے کے بعد زندگی بعد موت کے متعلق مذہبی عقیدے کو نہ ماننا ایسا ہی ہے، جیسے کسی دیہاتی آدمی کا اصرار ہو کہ ایسی کوئی صورت نہیں ہو سکتی کہ دو آدمی ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کریں، اس کے بعد اس کے ایک عزیز کو دور کے شہر سے ٹیلی فون کر کے رسیور اس کے کان پر لگا دیا جائے، مگر جب وہ بات کر چکے تو کہے ـــــ "کیا ضروری ہے کہ وہ میرے عزیز کی آواز ہو ممکن ہے، کوئی مشین بول رہی ہو۔"

اثباتِ رسالت

خدا کے بعد مذہب کا دوسرا اہم عقیدہ رسالت یا وحی والہام ہے۔یعنی یہ عقیدہ کہ خدا انسانوں میں سے کسی انسان پر اپنا کلام اتارتا ہے، اور اس کے ذریعہ سے تمام انسانوں کو اپنی مرضی سے باخبر کرتا ہے، اب چونکہ بظاہر ہمیں خدا اور صاحب وحی کے درمیان ایسا کوئی "تار" نظر نہیں آتا جس پر خدا کا پیغام سفر کر کے انسانوں تک پہونچتا ہو، اس لئے بہت سے لوگ اس دعوے کے صحیح ہونے سے انکار کر دیتے ہیں، حالانکہ یہ ایک ایسی چیز ہے، جس کو ہم اپنے معلوم حقائق کی مدد سے باآسانی سمجھ سکتے ہیں۔

ہمارے گرد و پیش ایسے واقعات موجود ہیں، جو ہمارے محدود دائرۂ سماعت سے کہیں بالاتر ہیں، مگر اس کے باوجود انھیں اخذ کیا جا سکتا ہے، انسان نے آج ایسے آلات ایجاد کر لئے ہیں، جن سے وہ ایک مکھی کے چلنے کی آواز میلوں دور سے اس طرح سن سکتا ہے، جیسے وہ اس کے کان کے پردہ پر رینگ رہی ہو، حتیٰ کہ وہ کائناتی شعاعوں (Cosmic Rays) کے تصادم تک کو ریکارڈ کر لیتا ہے، اس طرح کے آلات اب کثرت سے انسان کو حاصل ہو چکے ہیں، جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ اخذ و سماعت کی ایسی صورتیں بھی ممکن ہیں جو معمولی حواس کے ذریعے ایک شخص کے لئے ناممکن اور ناقابل قیاس ہوں۔

پھر یہ مخصوص ذرائع ادراک صرف مشینی آلات تک محدود نہیں، بلکہ حیوانوں کا مطالعہ بتاتا ہے، کہ فطرت نے خود ذی حیات اشیاء کے اندر ایسی طاقتیں رکھی ہیں، بے شک عام انسان کے حواس

بہت محدود ہیں مگر جانوروں کے حواس کا معاملہ اس سے مختلف ہے، کتا اپنی متجسس ناک سے اس جانور کی بو سونگھ لیتا ہے، جو راستہ سے نکل گیا، چنانچہ کتے کی اس صلاحیت کو جرائم کی تفتیش میں استعمال کیا جاتا ہے، چور جس تالے کو توڑ کر کمرے میں گھسا ہے، اس تالے کو جاسوسی کتے (Scott Dog) کو سونگھایا جاتا ہے، اور اس کے بعد اسے چھوڑ دیا جاتا ہے، وہ سیکڑوں انسانوں کے درمیان ٹھیک اس شخص کو تلاش کرکے اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے، جس نے اپنے ہاتھ سے تالے کو چھوا تھا، کتنے جانور ہیں، جو ایسی آوازیں سنتے ہیں، جو ہماری قوت سماعت سے باہر ہیں۔

تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ جانوروں میں اشراق (Telepathy) کی صلاحیت پائی جاتی ہے، ایک مادہ پتنگے (Moth) کو کوٹھے میں کھلی کھڑکی کے پاس رکھ دیجئے، وہ کچھ مخصوص اشارے کرے گی، یہ اشارے اسی نوع کے نر پتنگے حیرت انگیز فاصلے سے سن لیں گے اور اس کا جواب دیں گے جھینگر اپنے پاؤں یا پر ایک دوسرے پر رگڑتا ہے، رات کے سناٹے میں آدھے میل دور تک یہ آواز سنائی دیتی ہے، یہ چھ سو ٹن ہوا کو ہلاتا ہے، اور اس طرح اپنے جوڑے کو بلاتا ہے، اس کی مادہ جو بظاہر بالکل خاموش ہوتی ہے، مگر پراسرار طریقہ پر کوئی ایسا بے آواز جواب دیتی ہے جو نر تک پہنچ جاتا ہے، نر اس پراسرار جواب کو جسے کوئی بھی نہیں سنتا، حیرت انگیز طور پر سن لیتا ہے، اور ٹھیک اسی سمت میں اس کے مقام پر جاکر اس سے مل جاتا ہے اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک معمولی ٹڈے (Grasshopper) کی قوت سماعت اس قدر تیز ہوتی ہے کہ ہائیڈروجن کے ایٹم کے نصف قطر کے برابر کی حرکت تک کو وہ محسوس کرلیتا ہے۔

اس طرح کی کثیر مثالیں موجود ہیں، جو یہ بتاتی ہیں کہ ایسے ذرائع مواصلات ممکن ہیں جو بظاہر نظر نہ آتے ہوں مگر اس کے باوجود وہ بطور واقعہ موجود ہوں اور مخصوص حواس رکھنے والے ذی حیات اس کا ادراک کرلیتے ہوں، ان حالات میں اگر ایک شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ "مجھے خدا کی طرف سے ایسی

آوازیں سنائی دیتی ہیں، جن کو عام لوگ نہیں سنتے" تو اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے، اگر اس دنیا میں ایسی آوازیں ممکن ہیں، جو آلات سنتے ہوں مگر انسان نہ سنتے ہوں، اگر یہاں ایسی پیغام رسانی ہو رہی ہے، جس کو ایک مخصوص جانور تو سن لیتا ہے، مگر دوسرا اسے نہیں سنتا، تو آخر اس واقعہ میں استبعاد کا کیا پہلو ہے کہ خدا اپنی مصالح کے تحت بعض مخفی ذرائع سے ایک انسان تک اپنا پیغام بھیجتا ہے، اور اس کے اندر ایسی صلاحیتیں پیدا کر دیتا ہے کہ وہ اس کو اخذ کر سکے اور اس کو پوری طرح سمجھ کر قبول کرے، حقیقت یہ ہے کہ وحی و الہام کے تصور اور ہمارے مشاہدات و تجربات میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے، بلکہ یہ اسی قسم کے مشاہدات کی ایک مخصوص صورت ہے، جس کا مختلف شکلوں میں ہم تجربہ کر چکے ہیں، یہ ایک امکان کو واقعہ کی صورت میں تسلیم کرنا ہے۔

پھر اشراق اور غیب دانی کے تجربات بتاتے ہیں کہ یہ چیز صرف حیوانوں تک محدود نہیں بلکہ انسان کے اندر بھی بالقوہ اس قسم کی خصوصیات موجود ہیں، ڈاکٹر الکسس کیرل کے الفاظ میں "فرد کی نفسیاتی سرحدیں مکاں اور زماں کے اندر محض فرضی Suppositions ہوتی ہیں" (ص ۲۴۴) چنانچہ ایک عامل کسی آواز اور خارجی ذریعہ کے بغیر اپنے معمول پر توجہ ڈالتا ہے، جس کے نتیجہ میں وہ اس پر مصنوعی نیند (Hypnotic Sleep) طاری کر سکتا ہے، اس کو ہنسا یا رلا سکتا ہے، اس کے ذہن میں مخصوص خیالات القا کر سکتا ہے یہ ایک ایسا عمل ہے جس میں نہ کوئی ظاہری آلہ استعمال ہوتا اور نہ عامل اور معمول کے سوا کوئی شخص اسے محسوس کرتا، پھر اسی نوعیت کا واقعہ بندے اور خدا کے درمیان کیوں ہمارے لئے ناقابل تصور ہو، خدا کو ماننے اور انسانی زندگی میں اشراقی قوت کا تجربہ کر لینے کے بعد ہمارے لئے وحی و الہام سے انکار کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی۔

دسمبر ۱۹۵۰ء کا واقعہ ہے، بویریا کے حکام نے ایک وی آئی عامل توجہ (Hypnotist) فرنٹز سٹروبل پر ریڈیو پروگرام میں "خلل اندازی بذریعہ ٹیلی پیتھی" کے الزام میں مقدمہ دائر کر دیا، یہ جناب ہوٹل واقع میونخ میں اپنے کرتب کا مظاہرہ کرتے ہوئے سٹروبل نے ایک تماشہ بین کو تاش کا ایک پتہ اٹھا کر دیا اور

اس سے کہا کہ وہ اس کا نام حسب منشا ترتیب کے ساتھ اپنے دل میں سوچ لے، ہپناٹسٹ نے دعویٰ کیا کہ وہ اس پتے کا نام مع ترتیب (جیسا کچھ پتہ اٹھانے والے نے اپنے دل میں سوچ رکھا تھا) خود جانے بغیر ریڈیو کے اس اناؤنسر کی جانب منتقل کر دے گا، جو اس وقت ریڈیو پر خبریں سنا رہا تھا۔

چند ہی سکنڈ بعد حیرت زدہ سامعین نے سوئٹ ریڈیو کے اناؤنسر کی لڑکھڑاتی زبان میں سنا "ریجنا ہوٹل، حکم کی ملکہ" پتے کا نام بھی درست تھا، اور ترتیب بھی پتہ اٹھانے والے کی سوچ کے عین مطابق تھی۔

اناؤنسر کی وحشت اس کی آواز سے واضح طور پر مترشح ہو رہی تھی، تاہم وہ خبریں سنائے چلا گیا، ادھر سیکڑوں ریڈیو سننے والے اس عجیب واقعہ کا سبب معلوم کرنے کے لئے براڈکاسٹنگ اسٹیشن کو ٹیلی فون کر رہے تھے، کیونکہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ خبروں کے پروگرام کے درمیان "ریجنا ہوٹل، حکم کی ملکہ" کے الفاظ کا کیا مطلب ہے، ڈاکٹر معائنہ کے لئے آیا تو اس نے پایا کہ اناؤنسر شدید اضطرابی کیفیت میں مبتلا ہے، اناؤنسر نے بتایا کہ خبریں پڑھتے پڑھتے اس کے سر میں اچانک ایک درد سا اٹھا، اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں کہ کیا ہوا۔[1]

میں کہوں گا کہ اگر انسان کو یہ قدرت حاصل ہے کہ ایک انسان کے خیالات دوسرے انسان کو بعینہٖ منتقل کر دے، جبکہ دونوں کے درمیان غیر معمولی فاصلہ ہو اور اس کے لئے کوئی ظاہری واسطہ استعمال نہ کیا گیا ہو تو القائے کلام کا یہی واقعہ خالقِ کائنات کی طرف سے کیوں وجود میں نہیں آسکتا، انسانی صلاحیت کا یہ اظہار جس کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں یہ ایک تجرباتی قرینہ ہے، جس سے ہم اس امکان کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ خدا اور بندے کے درمیان کسی واسطہ کے بغیر کس طرح الفاظ اور معانی کا تعلق قائم ہوتا ہے، اور ایک کے خیالات

---

[1] غیب دانی اور اشراق کے ان ثابت شدہ مظاہر کی توجیہ کے لئے مختلف نظریے پیش کئے گئے ہیں، مثلاً یہ کہ دماغ سے کسی قسم کی لہریں نکلتی ہیں جو نہایت تیزی سے عالم میں پھیل جاتی ہیں، چنانچہ اس کو نظریہ امواجِ دماغی Brain-Wave Theory کہا جاتا ہے۔

Religion, Philosophy and Psychical Research
by C.D. Broad, p. 47-48

نیز ملاحظہ ہو الکسس کیرل کی کتاب صفحات ۴۹-۲۴۴۔

دوسرے کو بعینہ منتقل ہو جاتے ہیں، اشراقی پیغام رسانی جو بندوں کے درمیان ایک معلوم اور ثابت شدہ واقعہ ہے، ایک ایسا قرینہ ہے، جس سے ہم اس اشراق کو سمجھ سکتے ہیں، جو بندے اور خدا کے درمیان ہوتا ہے، اور جس کی کامل اور متعین صورت کو مذہب کی اصطلاح میں "وحی" کہا جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ وحی اپنی نوعیت کے اعتبار سے اسی قسم کا ایک مخصوص کائناتی اشراق ہے، جس کا تجربہ محدود پیمانے پر ہم انسانی زندگی میں بار بار کر چکے ہیں اور کرتے رہتے ہیں۔

وحی و الہام کو ممکن ماننے کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس کی ضرورت بھی ہے یا نہیں کہ خدا کسی انسان سے مخاطب ہو اور اس کے ذریعہ سے اپنا کلام بھیجے، اس کی ضرورت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ رسول آدمی کو جس چیز سے باخبر کرتا ہے، وہ آدمی کی شدید ترین ضرورت ہے، مگر وہ خود اپنی کوشش سے اسے حاصل نہیں کر سکتا ہزاروں برس سے انسان حقیقت کی تلاش میں ہے، وہ سمجھنا چاہتا ہے کہ یہ کائنات کیا ہے، انسان کا آغاز و انجام کیا ہے، خیر کیا ہے، اور شر کیا ہے، انسان کو کیسے قابو میں لایا جائے، زندگی کو کیسے منظم کیا جائے کہ انسانیت کے سارے تقاضے اپنے صحیح مقام کو پاتے ہوئے متوازن ترقی کر سکیں، مگر ابھی تک اس تلاش میں کامیابی نہیں ہوئی، تھوڑی مدت کی تلاش و جستجو کے بعد ہم نے لوہے، اور پٹرول کی سائنس بالکل ٹھیک جان لی اور اس طرح طبیعی دنیا کی سیکڑوں سائنسوں کے بارے میں صحیح ترین واقفیت حاصل کر لی، مگر انسان کی سائنس ابھی تک دریافت نہیں ہوئی، طویل ترین مدت کے درمیان بہترین دماغوں کی لاتعداد کوششوں کے باوجود یہ سائنس ابھی تک اپنے موضوع کی ابتدائیات کو بھی متعین نہ کر سکی، اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس معاملے میں ہمیں خدا کی مدد کی ضرورت ہے، اس کے بغیر ہم اپنا "دین" معلوم نہیں کر سکتے۔

یہ بات انسان جدید کو تسلیم ہے کہ زندگی کا راز ابھی تک اس کو معلوم نہ ہو سکا، مگر اسی کے ساتھ وہ یقین رکھتا ہے کہ وہ کبھی نہ کبھی اس راز کو معلوم کرے گا، سائنس اور صنعت کے پیدا کئے ہوئے ماحول کا انسان کے لئے سازگار نہ ہونا اسی وجہ سے ہے کہ "اگر ایک طرف جامد مادے کے علوم کی وسیع پیمانے پر ترقی ہوئی ہے تو دوسری طرف جاندار ہستیوں کے علوم بالکل ابتدائی حالت پر باقی ہیں" اس دوسرے شعبہ پر جن لوگوں نے کام کیا، وہ حقیقت کو نہ پا سکے،

اور اپنے تخیلات کی دنیا میں بھٹک رہے ہیں، نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر الکسس کیرل Alexis Carrel کے الفاظ میں

"فرانسیسی انقلاب کے اصول اور مارکس اور لینن کے نظریے محض ذہنی اور قیاسی انسانوں پر منطبق ہو سکتے ہیں، اس بات کو صاف طور پر محسوس کرنا چاہیے کہ انسانی تعلقات کے قوانین (Law of Human Relations) اب تک معلوم نہیں ہو سکے ہیں، سماجیات اور اقتصادیات کے علوم محض قیاسی ہیں اور ناقابل ثبوت ہیں۔"

Man the Unknown, p.37

بلاشبہ موجودہ زمانے میں علوم نے بہت ترقی کی ہے، مگر ان ترقیات نے مسئلہ کو اور الجھا دیا ہے، اس نے کسی بھی درجہ میں اس کو حل کرنے میں کوئی مدد نہیں کی ہے، جے، ڈبلیو، این سولیون (J.W.N. Sullivan) لکھتا ہے

"سائنس نے موجودہ زمانے میں جس کائنات کو دریافت کیا ہے، وہ تمام فکری تاریخ کے مقابلے میں بہت زیادہ پراسرار ہے، اگرچہ فطرت کے بارے میں ہماری معلومات تمام پچھلے ادوار کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں، مگر اس کے باوجود یہ کثیر معلومات ایک اعتبار سے بہت کم تشفی بخش ہیں ــــ کیونکہ ہر سمت میں ہم ابہام (Ambiguities) اور تضاد (Contradictions) سے دوچار ہو رہے ہیں۔"

Limitations of Science, p. 1

زندگی کے راز کو مادی علوم میں تلاش کرنے کا یہ عبرت ناک انجام بتاتا ہے کہ زندگی کا راز انسان کے لئے ناقابل دریافت ہے[1]۔ ایک طرف صورت حال یہ ہے کہ زندگی کی حقیقت کو جاننا ضروری ہے، اس کے بغیر ہم کوئی عمل نہیں کر سکتے، ہمارے بہترین جذبات اسے جاننا چاہتے ہیں، ہماری ہستی کا اعلیٰ ترین جز جس کو ہم فکر یا ذہن کہتے ہیں، وہ اس کے بغیر مطمئن ہونے کے لئے کسی طرح راضی نہیں، ہماری زندگی کا سارا نظام اس کے بغیر ابتر ہے اور لاینحل معمہ بنا ہوا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے، مگر یہی سب سے بڑی ضرورت

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر الکسس کیرل کی کتاب صفحات ۱۶-۱۹

ہم خود سے پوری نہیں کر سکتے۔

کیا یہ صورت حال اس بات کی کافی دلیل نہیں ہے کہ انسان "وحی" کا محتاج ہے، زندگی کی حقیقت کا انتہائی ضروری ہونے کے باوجود انسان کے لئے ناقابل دریافت ہونا ظاہر کرتا ہے کہ اس کا انتظام اسی طرح خارج سے کیا جانا چاہئے، جیسے روشنی اور حرارت انسان کے لئے ناگزیر ہونے کے باوجود اس کے اپنے بس سے باہر ہے، مگر قدرت نے حیرت انگیز طور پر سورج کے ذریعہ اس کا انتظام کر دیا ہے —— (اس مسئلہ پر مزید مواد اگلے باب میں ملے گا۔)

وحی والہام کو ممکن اور ضروری تسلیم کر لینے کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے، کہ جو شخص اس کا دعویٰ کر رہا ہے، وہ فی الواقع صاحب وحی ہے یا نہیں، ہمارے عقیدے اور ایمان کے مطابق اس قسم کے صاحبان وحی بہت کثیر تعداد میں اس زمین پر پیدا ہو چکے ہیں، مگر اس باب میں ہم خاص طور پر آخری رسول حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے دعوئے نبوت پر گفتگو کریں گے، اس لئے کہ آپ کے دعوئے نبوت کا ثابت ہونا در اصل سارے انبیاء کے دعوئے نبوت کا ثابت ہونا ہے، کیونکہ آپ دیگر انبیاء کے منکر نہیں ہیں، بلکہ ان کی تصدیق کرنے والے ہیں، اور اس لئے بھی کہ اب موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے آپ ہی خدا کے رسول ہیں، آپ کے بعد اب کوئی دوسرا رسول آنے والا نہیں ہے، اس لئے عملاً اب نسل انسانی کی نجات و خسران کا معاملہ آپ ہی کے دعوئے نبوت کو ماننے یا نہ ماننے سے متعلق ہے۔

سن عیسوی کے لحاظ سے ۲۹ راگست ۵۷۰ء کی صبح کو مکہ میں ایک بچہ پیدا ہوا، چالیس سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد اس نے یہ اعلان کیا کہ خدا نے مجھ کو اپنا آخری رسول بنایا ہے، اور میرے پاس اپنا پیغام بھیج کر مجھے اس خدمت کے لئے مامور کیا ہے کہ میں اس کے پیغام کو تمام انسانوں تک پہنچا دوں، جو میری اطاعت کرے گا وہ خدا کے یہاں سرفراز ہو گا اور جو میری نافرمانی کرے گا وہ ہلاک کر دیا جائے گا۔

یہ آواز آج بھی پوری شدت کے ساتھ ہمارے سروں پر گونج رہی ہے، یہ ایسی آواز نہیں ہے کہ کوئی

شخص اس کو سنے اور نظر انداز کر دے، بلکہ یہ ایک زبردست مطالبہ ہے، اس آواز کا تقاضا ہے کہ ہم اس کے اوپر غور کریں، اس کے بعد اگر اس کو غلط پائیں تو کھلے دل سے اسے رد کر دیں اور صحیح پائیں تو کھلے دل سے اس کو قبول کر لیں۔

کسی چیز کے علمی حقیقت بننے کے لئے اسے تین مرحلوں سے گزرنا ہوتا ہے۔

۱۔ مفروضہ (Hypothesis)

۲۔ مشاہدہ (Observation)

۳۔ تصدیق (Verification)

پہلے ایک مفروضہ یا تصور ذہن میں آتا ہے، پھر مشاہدہ کیا جاتا ہے، اس کے بعد اگر مشاہدہ سے اس کی تصدیق ہو جائے تو اس مفروضہ کو واقعہ تسلیم کر لیا جاتا ہے، اس ترتیب میں کبھی فرق بھی ہو جاتا ہے، یعنی پہلے کچھ مشاہدات سامنے آتے ہیں، اور ان مشاہدات سے ایک تصور یا مفروضہ ذہن میں قائم ہوتا ہے، پھر جب یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ مشاہدات فی الواقع اس مفروضہ کی تصدیق کر رہے ہیں تو وہ حقیقت قرار پا جاتا ہے۔

اس اصول کے مطابق نبی کا دعوئے نبوت گویا ایک "مفروضہ" کے طور پر ہمارے سامنے ہے، اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مشاہدات اس کی تصدیق کر رہے ہیں یا نہیں، اگر مشاہدات اس کے حق میں گواہی دے دیں تو اس کی حیثیت ایک مصدقہ حقیقت (Verified Fact) کی ہو جائے گی، اور ہمارے لئے ضروری ہو جائے گا کہ ہم اس کو تسلیم کریں۔

اب دیکھئے کہ وہ کیا شاہدات ہیں جو اس "مفروضہ" کی تصدیق کے لئے درکار ہیں جن کی بنیاد پر ہم نبی کے دعوے کو جانچیں اور اس کے مطابق دعوے کا صحیح یا غلط ہونا معلوم کریں، دوسرے لفظوں میں وہ کون سے خارجی مظاہر ہیں، جن کی روشنی میں یہ متعین ہوتا ہے کہ آپ فی الواقع خدا کے رسول تھے، ذات رسول میں جمع ہونے والی وہ کون سی خصوصیات ہیں، جن کی توجیہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ ہم ان کو خدا کا رسول مانیں،

میرے نزدیک یہ حسب ذیل ہیں، جو شخص اپنے بارے میں رسول ہونے کا دعویٰ کرے، اس کے اندر دو خصوصیات لازمی طور پر ہونی چاہئیں۔

۱۔ ایک یہ کہ وہ غیر معمولی طور پر ایک معیاری انسان ہو، کیونکہ وہ شخص جس کو ساری نسل انسانی میں اس لئے چنا جائے کہ وہ خدا سے ہم کلام ہو اور زندگی کی درستگی کا پروگرام اس کے ذریعہ سے منکشف کیا جائے، یقینی طور پر اس کو نسل انسانی کا بہترین فرد ہونا چاہئے اور اس کی زندگی میں اس کے آدرشوں (Ideals) کو بہ تمام و کمال ظہور کرنا چاہئے، اگر اس کی زندگی ان اوصاف سے مزین ہے تو یہ اس کے دعوے کی صداقت کا کھلا ہوا ثبوت ہے، کیونکہ اس کا دعویٰ اگر غیر حقیقی ہو تو وہ زندگی میں اتنی بڑی حقیقت بن کر نمایاں نہیں ہو سکتا کہ اس کو اخلاق و کردار میں ساری انسانیت سے بلند کر دے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ اس شخص کا کلام اور اس کا پیغام ایسے پہلوؤں سے بھرا ہوا ہونا چاہئے جو عام انسان کے بس سے باہر ہو، جس کی امید کسی ایسے ہی انسان سے کی جا سکتی ہو جس پر مالک کائنات کا سایہ پڑا ہو، عام انسان ایسا کلام پیش کرنے پر قادر نہ ہو سکیں۔

یہ دو معیار ہیں جن پر ہمیں رسول کے دعوئے نبوت کو جانچنا ہے۔

پہلی بات کے سلسلے میں تاریخ کی قطعی شہادت یہ ہے کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) ایک غیر معمولی سیرت کے آدمی تھے، ہٹ دھرمی کے ذریعہ تو کسی بھی حقیقت کا انکار ممکن ہے، اور دھاندلی کی زبان میں ہر الٹی بات کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے، یہ منظر ہم خود اپنے ملک میں دیکھ چکے ہیں کہ کمیونسٹ چین نے صریح طور پر ہندوستانی سرحد کی خلاف ورزی کی اور جب احتجاج کیا گیا تو الٹا اس نے ہندوستان کے اوپر الزام لگانا شروع کر دیا کہ وہ اس کی سرحد کے اندر گھس آیا ہے، ہندوستان کے نام حکومت چین کا خط جو جنوری ۱۹۶۰ء میں شائع کیا گیا اس میں ہندوستانی سرحد کے اندر واقع دو لاکھ تیس ہزار مربع کیلو میٹر پر چین کا حق جتایا گیا ہے اور چینی وزیر اعظم کا کہنا ہے کہ چینی فوجوں کی پیش قدمی چین کے علاقے سے ہندوستانی فوجوں کو پیچھے ڈھکیلنے کے لئے عمل میں آئی ہے،

مگر جو شخص اس قسم کے تعصب کا مریض نہ ہو اور کھلے دل سے حقیقت کا مطالعہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، وہ لازماً تسلیم کرے گا کہ آپؐ کی زندگی اخلاقی حیثیت سے نہایت اعلیٰ وارفع تھی۔

محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو چالیس سال کی عمر میں نبوت ملی، اس سے پہلے آپ کا پورا دور اخلاقی لحاظ سے اس قدر ممتاز تھا کہ آپ کو لوگ سچا اور دیانت دار کہہ کر پکارنے لگے تھے "اَلصَّادِقُ الامین" آپ کا مشہور لقب بن گیا تھا، آپ کے متعلق یہ بات ساری آبادی میں متفق علیہ تھی کہ آپ ایک نہایت ایمان دار شخص ہیں، اور کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے۔

دعوئے نبوت سے پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ قریش نے کعبہ کی تعمیر نو کا ارادہ کیا جب تعمیر ہونے لگی تو اس بات پر شدید اختلاف پیدا ہو گیا کہ حجر اسود کو نئی تعمیر میں کون شخص اس کی جگہ پر نصب کرے، چار پانچ دن تک یہ اختلاف جاری رہا اور قریب تھا کہ تلواریں چل جائیں، بالآخر طے پایا کہ اس جھگڑے کا فیصلہ وہ شخص کرے گا جو کل صبح کو سب سے پہلے بیت اللہ میں داخل ہو، دوسرے دن لوگوں نے جب سب سے پہلے داخل ہونے والے انسان کو دیکھا تو پکار اٹھے "هٰذَا الْاَمِيْنُ رَضِيْنَا" (امین آگیا، ہم سب اس کے فیصلہ پر متفق ہیں)

(بخاری، باب ماذکر فی الحجر الاسود)

ہمیں تاریخ میں کسی ایسے شخص کا علم نہیں جس کی زندگی بحث و نزاع کا موضوع بننے سے پہلے چالیس سال جیسی لمبی مدت تک لوگوں کے سامنے رہی ہو اور اس کے جاننے والے اس کی سیرت و کردار کے بارے میں اتنی غیر معمولی رائے رکھتے ہوں۔

پہلی بار آپ پر غار حرا میں وحی اتری تو یہ آپ کے لئے ایک ایسا غیر معمولی واقعہ تھا جس کا آپ کو پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا، آپ شدت احساس کے ساتھ گھر لوٹے اور اپنی اہلیہ سے، جو آپ سے عمر میں بڑی تھیں، اس واقعہ کا ذکر کیا، اہلیہ کا جواب تھا ——"اے ابو القاسم خدا یقیناً آپ کی حفاظت کرے گا، کیونکہ آپ سچ بولتے ہیں، آپ دیانت دار ہیں، آپ برائی کا بدلہ بھلائی سے دیتے ہیں اور لوگوں کے حقوق ادا کرتے ہیں۔"

ابوطالب آپ کے چچا تھے، ان کے سامنے آپ نے اسلام کی دعوت پیش کی تو انھوں نے یہ کہہ کر اسے ماننے سے انکار کر دیا کہ میں اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ نہیں سکتا، مگر اس کے بعد جب انھیں اپنے لڑکے علی (رضی اللہ تعالےٰ عنہ) سے معلوم ہوا کہ وہ آپ پر ایمان لا چکے ہیں تو ابوطالب نے کہا "بیٹے! تم اس کے لئے آزاد ہو کیونکہ مجھے یقین ہے کہ محمد تم کو خیر کے سوا کسی چیز کی طرف نہیں بلائیں گے"۔ (آئیڈیل پرافٹ صفحہ ۶۸)

نبوت ملنے کے بعد جب آپ نے پہلی بار کوہ صفا کے دامن میں لوگوں کو جمع کر کے اپنی دعوت پیش کی اس وقت آپ نے اپنی دعوتی تقریر شروع کرنے سے پہلے حاضرین سے یہ سوال کیا "تمہارا میرے متعلق کیا خیال ہے" جواب میں بالاتفاق یہ آواز آئی۔

ماجربنا علیک الا صدقا۔ تمہارے اندر ہم نے سچائی کے سوا کوئی اور بات کبھی نہیں دیکھی ہے۔ (متفق علیہ)

پیغمبر (صلے اللہ علیہ وسلم) کی ابتدائی زندگی کے بارے میں یہ ایک ایسا ممتاز تاریخی ریکارڈ ہے جس کی مثال کسی بھی شاعر، فلسفی، مفکر یا مصنف کے یہاں نہیں مل سکتی۔

جب آپ نے پیغمبری کا اعلان کیا تو مکہ کے لوگ جو آپ کو اچھی طرح جانتے تھے، ان کے لئے یہ سوال خارج از بحث تھا کہ آپ کو نعوذ باللہ جھوٹا یا جعل ساز سمجھیں، کیونکہ یہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی اب تک کی پوری زندگی کے بالکل خلاف تھا، اس لئے انھوں نے کبھی آپ پر اس قسم کا الزام نہیں لگایا، بلکہ کہا تو یہ کہا کہ اس شخص کی عقل کھو گئی ہے، وہ شاعرانہ مبالغہ کر رہے ہیں، اور ان پر کسی کا جادو چل گیا ہے، ان پر جنات سوار ہے، مخالفین نے یہ سب کچھ کہا مگر کسی کی جرأت یہ نہ ہوئی کہ وہ آپ کی صداقت اور دیانت داری پر شبہ ظاہر کرے، یہ حیرت انگیز بات ہے کہ ایک شخص جس کی قوم اس کی دشمن ہو چکی ہے، اور وطن میں اس کا رہنا بھی اسے گوارا نہیں ہے، اس شخص کے بارے میں اس کی دشمن قوم کا حال تاریخ یہ بیان کرتی ہے۔

لیس بمکۃ احد عندہ شیئ یخشی — مکہ میں جس کسی کے پاس بھی کوئی ایسی چیز ہوتی جس کے

علیہ الا وضعہ عندہ لما یعلم من	بارے میں اسے کسی قسم کا اندیشہ ہوتا تو اسے آپ
صدقہ و امانتہ۔	کے پاس رکھ دیتا، کیونکہ ہر ایک کو آپ کی سچائی
(سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۹۵)	اور دیانتداری کا یقین تھا۔

نبوت کے تیرہویں سال عین اس وقت جب کہ آپ کے مخالفین آپ کا مکان گھیرے ہوئے کھڑے تھے، اور اس بات کا قطعی فیصلہ کر چکے تھے کہ باہر نکلتے ہی آپ کو قتل کر دیں گے، آپ گھر کے اندر اپنے نوجوان عزیز علی ابن ابی طالب کو یہ وصیت کر رہے تھے کہ میرے پاس مکہ کے فلاں فلاں لوگوں کا مال امانت رکھا ہوا ہے، میرے جانے کے بعد تم ان سب کا مال انھیں واپس کر دینا۔

نضر بن حارث جو آپ کا مخالف ہونے کے ساتھ دنیوی معاملات میں قریش کے اندر سب سے زیادہ تجربہ کار تھا، اس نے ایک روز اپنی قوم سے کہا— "قریش کے لوگو! محمد کی دعوت نے تم کو ایسی مشکل میں ڈال دیا ہے، جس کا کوئی حل تمہارے پاس نہیں ہے، وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے بچپن سے جوان ہوئے ہیں، تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ تمہارے درمیان سب سے زیادہ سچے، سب سے زیادہ امانت دار اور سب سے زیادہ پسندیدہ شخص تھے، لیکن جب ان کے بال سفید ہونے کو آئے اور انھوں نے وہ کلام پیش کیا، جس کو تم سن رہے ہو تو اب تمہارا حال یہ ہے کہ تم کہتے ہو "یہ شخص جادوگر ہے، یہ شاعر ہے، یہ مجنون ہے" خدا کی قسم میں نے محمد کی باتیں سنی ہیں، محمد نہ جادوگر ہے، نہ وہ شاعر ہے، نہ وہ مجنون ہے، مجھے یقین ہے کہ کوئی اور مصیبت تمہارے اوپر آنے والی ہے۔" (سیرۃ النبی لابن ہشام جلد ۱ ص ۳۱۹)

ابوجہل جو آپ کا سخت ترین دشمن تھا، وہ کہتا ہے— "محمد! میں یہ نہیں کہتا کہ تم جھوٹے ہو، مگر جس چیز کی تم تبلیغ کر رہے ہو اس کو میں صحیح نہیں سمجھتا۔" (ترمذی)

آپ کی نبوت چونکہ صرف عرب کے لئے نہیں تھی، بلکہ ساری دنیا کے لئے تھی، اس لئے اپنی زندگی ہی میں آپ نے ہمسایہ ممالک کے بادشاہوں کو دعوتی خطوط روانہ کئے، روم کے بادشاہ ہرقل کو آپ کا دعوت نامہ

ملا تو اس نے حکم دیا کہ عرب کے کچھ لوگ یہاں ہوں تو حاضر کئے جائیں۔ اسی زمانے میں قریش کے چند لوگ تجارت کی غرض سے شام گئے ہوئے تھے ــــ وہ دربار میں پہنچے تو ہرقل نے پوچھا تمہارے شہر میں جس شخص نے خدا کا رسول ہونے کا دعویٰ کیا ہے، تم میں سے کوئی اس کا قریبی رشتہ دار بھی ہے ــــ ابوسفیان نے جواب دیا وہ میرے خاندان کا ہے، اس کے بعد ہرقل اور ابوسفیان کے درمیان جو گفتگو ہوئی، اس کے چند فقرے یہ ہیں۔

ہرقل: اس دعوے سے پہلے کبھی تم نے اس کو جھوٹ بولتے ہوئے بھی سنا ہے۔

ابوسفیان: کبھی نہیں۔

ہرقل: کیا وہ عہد و پیمان کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

ابوسفیان: ابھی تک اس نے کسی عہد کی خلاف ورزی نہیں کی۔

ہرقل نے یہ سن کر کہا ــــ "جب یہ تجربہ ہو چکا ہے کہ وہ آدمیوں کے معاملے میں کبھی جھوٹ نہیں بولا، تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس نے خدا کے معاملے میں اتنا بڑا جھوٹ گڑھ لیا ہو"

یہ اس وقت کی گفتگو ہے جب کہ ابوسفیان ابھی ایمان نہیں لائے تھے، اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے کٹر دشمن تھے، بلکہ آپ کے خلاف جنگ کی قیادت کر رہے تھے، وہ خود کہتے ہیں کہ "اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ ہرقل کے دربار میں جو دوسرے قریشی بیٹھے ہوئے ہیں، وہ مجھے جھوٹا مشہور کر دیں گے تو میں اس موقع پر غلط بیانی سے کام لیتا" (بخاری، کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ)

ساری تاریخ میں کسی بھی ایسے شخص کا نام نہیں لیا جا سکتا جس کے مخاطبین شدید مخالف ہونے کے باوجود اس کی زندگی اور سیرت کے بارے میں اتنی غیر معمولی رائے رکھتے ہوں، اور یہ واقعہ بجائے خود آپ کے رسول اللہ ہونے کا کافی ثبوت ہے، یہاں میں ڈاکٹر لیٹنر کا ایک اقتباس نقل کروں گا۔

"میں بہت ادب کے ساتھ یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اگر فی الواقع خدائے پاک کے یہاں سے

لہ ہرقل (قیصر روم) ان دنوں ایرانیوں پر فتح یابی کا شکرانہ ادا کرنے کے لئے بیت المقدس آیا ہوا تھا، وہیں اس کو خط ملا۔

جو تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے، الہام ہوتا ہے تو محمد کا مذہب الہامی مذہب ہے، اور اگر ایثار نفس دیانتداری، راسخ الاعتقادی، نیکی اور بدی کی کامل جانچ اور برائی دور کرنے کے عمدہ ذرائع ہی الہام کی ظاہری تین علامتیں ہیں تو محمد کا مشن الہامی تھا۔"

Life of Mohammad by M. Abdul Fazal

جب آپ نے دعوت دینی شروع کی تو آپ کی قوم نے سخت ترین مصیبتیں ڈالیں، آپ کی راہ میں کانٹے بچھا دیتے، نماز پڑھتے میں آپ کے جسم پر نجاست لا کر انڈیل دیتے، ایک دفعہ آپ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، عقبہ ابن ابی معیط نے آپ کے گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچا کہ آپ گھٹنوں کے بل گر پڑے، اس قسم کی حرکتوں سے جب آپ پر کوئی اثر نہیں ہوا تو انھوں نے آپ کا اور آپ کے سارے خاندان کا بائی کاٹ کر دیا اور آپ کو مجبور کیا کہ بستی سے باہر ایک پہاڑی درہ میں جا کر بے یار و مددگار پڑے رہیں، اس دوران میں کوئی ضرورت کی چیز حتیٰ کہ کھانا پینا بھی نہ کوئی شخص آپ تک پہونچا سکتا تھا' اور نہ آپ کے ہاتھ فروخت کر سکتا تھا —— آپ اپنے خاندان کے ساتھ تین سال تک اس حصار میں اس طرح رہے کہ پہاڑی درخت (طلح) کے پتے کھاتے تھے، آپ کے ایک ساتھی کا بیان ہے کہ اس زمانے میں ایک دفعہ رات کو سوکھا ہوا چمڑہ ہاتھ آگیا میں نے پانی سے اسے دھویا، پھر آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھایا تین سال کے بعد یہ حصار ختم ہوا۔

مکہ کے لوگوں کی یہ سنگ دلی دیکھ کر آپ طائف گئے جو مکہ سے تقریباً چالیس میل کے فاصلہ پر امرا و روسا کا شہر تھا، وہاں کے لوگوں نے آپ سے نہایت بری طرح کلام کیا، ایک نے کہا "کیا خدا کو تیرے سوا کوئی اور پیغمبری کے لئے نہیں ملتا تھا" پھر ان لوگوں نے بد کلامی ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ طائف کے اوباشوں کو ابھار کر آپ کے پیچھے لگا دیا، یہ لوگ ہر طرف سے آپ کے اوپر ٹوٹ پڑے اور آپ پر پتھر پھینکنا شروع کیا، انھوں نے اس بری طرح آپ کو زخمی کیا کہ آپ کے جوتے خون سے بھر گئے، آپ زخموں

سے چور ہو کر بیٹھ جاتے تو بازو تھام کر کھڑا کر دیتے جب چلنے لگتے تو پھر پتھر برساتے، ساتھ ساتھ گالیاں دیتے اور تالی بجاتے، اسی طرح شام ہونے تک آپ کے پیچھے لگے رہے، شام کو جب وہ زخم اور خون کی حالت میں آپ کو چھوڑ کر چلے گئے تو آپ نے ایک باغ میں انگور کی ٹٹیوں کی آڑ میں پناہ لی، یہی وہ واقعہ ہے جس کے متعلق آپ نے ایک مرتبہ حضرت عائشہ سے فرمایا: "لقد لقيت من قومك ما لقيت وكان اشد ما لقيت منهم يوم العقبة"

ان تمام ایذا رسانیوں کے باوجود آپ اپنا کام کرتے رہے، بالآخر قریش نے طے کیا کہ اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ آپ کو قتل کر دیا جائے، چنانچہ ایک رات کو قریش کے تمام سرداروں نے ننگی تلواروں کے ساتھ آپ کا مکان گھیر لیا تاکہ صبح کو جب آپ باہر نکلیں تو آپ کو قتل کر دیا جائے، مگر اللہ کی مدد سے آپ بحفاظت گھر سے نکل گئے، اور مدینہ جا کر قیام فرمایا۔

اس کے بعد قریش نے آپ کے ساتھ باضابطہ جنگ چھیڑ دی، اور دس سال تک مسلسل آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو جدال و قتال میں الجھائے رکھا، جس میں آپ کے دانت شہید ہوئے، بہترین ساتھی مارے گئے، وہ تمام مصائب جھیلنے پڑے جو جنگی حالت پیدا ہو جانے کے بعد جھیلنے ہوتے ہیں۔

اس طرح کی ۲۳ سالہ تاریخ کے بعد آپ کی عمر کے آخری دنوں میں مکہ فتح ہوا، اس وقت آپ کے دشمن بے یار و مددگار آپ کے سامنے کھڑے تھے، ایسے وقت میں فاتح جو کچھ کرتا ہے، وہ سب کو معلوم ہے، مگر آپ نے ان سے کوئی انتقام نہیں لیا، آپ نے پوچھا: "يا معشر قريش ما ترون اني فاعل فيكم؟" (قریش کے لوگو! بتاؤ اب میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کروں گا، انھوں نے کہا آپ شریف بھائی ہیں، اور شریف بھائی کی اولاد ہیں، آپ نے فرمایا:

اذهبوا فانتم الطلقاء۔ جاؤ تم سب کے سب آزاد ہو۔

(سیرۃ النبی لابن ہشام مطبوعہ قاہرہ جلد ۴ صفحہ ۳۲)

اعلیٰ ترین سلوک کی یہ حیرت انگیز مثال تاریخ کا ایک ایسا معجزہ ہے کہ اگر وہ دورِ تاریخ سے قبل کا ہوتا اور تاریخی طور پر ثابت نہ ہوتا تو یقیناً کہنے والے کہتے کہ یہ واقعہ نہیں بلکہ افسانہ ہے، کیونکہ کوئی انسان اب تک ایسا پیدا نہیں ہوا، پروفیسر باسورتھ اسمتھ Bosworth Smith کے یہ الفاظ کس قدر صحیح ہیں:۔

"جب میں آپ کے جملہ صفات اور تمام کارناموں پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالتا ہوں کہ آپ کیا تھے اور کیا ہو گئے اور آپ کے تابع دار پیروؤں نے جن میں آپ نے زندگی کی روح پھونک دی تھی کیا کیا کارنامے دکھائے تو آپ مجھے سب سے بزرگ، سب سے برتر اور اپنی نظیر آپ ہی دکھائی دیتے ہیں۔"

Mohammad and Mohammadenism, p. 344

پھر آپ نے اپنی ساری زندگی میں جس بے غرضی کا مظاہرہ کیا ہے وہ بھی اپنی مثال آپ ہے، منصبِ رسالت سے پہلے آپ مکہ کے ایک کامیاب تاجر تھے، اور آپ کے نکاح میں حضرت خدیجہؓ جیسی عرب کی دولتمند خاتون تھیں لیکن رسالت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد آپ کی تجارت اور حضرت خدیجہؓ کی دولت دونوں ختم ہو گئیں، اور آپ کو اس سلسلے میں اتنی مصیبتیں اٹھانی پڑیں کہ آپ خود فرماتے ہیں ——— "مجھے خدا کی راہ میں اس قدر ڈرایا اور ستایا گیا کہ کسی کو اتنا ڈرایا اور ستایا نہیں گیا، مجھ پر تیس شب و روز ایسے گزرے ہیں کہ میرے اور بلال کے لئے کھانا، جسے کوئی جاندار کھا سکے، بس اتنی مقدار میں ہوتا تھا کہ بلال اسے بغل میں چھپا لیتے۔"

(مشکوٰۃ کتاب الرقاق)

آپ نے صرف اپنے مشن کی خاطر یہ تکلیفیں اٹھائیں، ورنہ آپ کے لئے دوسری زندگی بھی ممکن تھی، جب آپ مکہ میں تھے، قریش کی طرف سے عتبہ یہ پیش کش لے کر آپ کی خدمت میں آیا کہ ——— "بھتیجے! اگر اس دعوت سے تم مال و دولت چاہتے ہو تو آؤ ہم اتنا مال جمع کر دیں کہ تم سب سے بڑے مال دار بن جاؤ، اگر اس سے سرداری مطلوب ہے تو بتاؤ ہم اس کے لئے بھی تیار ہیں کہ تمہیں اپنا سردار مان لیں، اگر سلطنت کی خواہش ہے تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بھی تسلیم کر لیں گے، لیکن اگر یہ واقعہ نہیں ہے، اور تم اپنے اندر جنون کی

کیفیت پاتے ہو اور تمھیں ایسی چیزیں نظر آتی ہیں جنھیں تم دور نہیں کر سکتے تو ہم تمہارا علاج کرنے کے لئے بھی تیار ہیں۔"

عقبہ کی یہ تقریر آپ خاموشی سے سنتے رہے، اور اس کے بعد جو جواب دیا وہ یہ کہ قرآن کی کچھ آیتیں پڑھ کر اسے سنا دیں۔ (سیرت ابن ہشام جلد ۱، صفحہ ۳۱۴)

مدینہ میں آپ ایک ریاست کے مالک تھے، آپ کو ایسے جاں نثار خادم حاصل تھے کہ ان جیسے وفادار اور جاں نثار ساتھی، آج تک کسی کو نہیں ملے گا، مگر واقعات بتاتے ہیں کہ آخر عمر تک آپ نے بالکل معمولی حالت میں گزار دی۔

حضرت عمرؓ اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ "میں آپ کے حجرہ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ آپ بغیر قمیص کے کھجور کی معمولی چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں، اور آپ کے جسم پر چٹائی کے نشانات صاف نظر آ رہے ہیں، حجرہ میں چاروں طرف نظر دوڑائی تو اس کا کل اثاثہ یہ تھا: ایک طرف تین چمڑے، ایک کونے میں کچھ چھال اور دوسرے کونے میں تقریباً ایک صاع جو، یہ منظر دیکھ کر میں بے اختیار رو پڑا، آپ نے پوچھا روتے کیوں ہو، میں نے عرض کیا قیصر و کسریٰ کو تو دنیا کی دولت حاصل ہے، اور آپ خدا کے رسول اس حال میں ہیں، یہ سن کر آپ بیٹھ گئے اور فرمایا: عمر! آخر تم کس خیال میں ہو، کیا تم نہیں چاہتے کہ ان کو دنیا ملے اور آخرت ہمارے حصے میں آئے۔"

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ دو دو مہینے گزر جاتے تھے، لیکن نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے مکانات میں چولہا نہیں جلتا تھا، عروہؓ نے پوچھا تو آپ لوگ زندہ کیسے رہتی تھیں، انھوں نے جواب دیا کہ کھجور اور پانی ہماری غذا تھی، ساتھ ہی بعض انصار دودھ بھیج دیا کرتے تھے، ان ہی کی دوسری روایت ہے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے مدینہ آنے کے بعد کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ کے گھر والوں نے مسلسل تین دن تک گیہوں کا استعمال کیا ہو، اور اسی حالت میں آپ دنیا سے چلے گئے۔

آپ نے قدرت رکھنے کے باوجود اس طرح زندگی گزاری اور جب دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنی

بیویوں اور اولاد کے لئے کچھ نہیں چھوڑا، نہ دینار نہ درہم نہ بکری نہ اونٹ اور نہ کسی چیز کی وصیت کی، اس کے بجائے دنیا کی عظیم ترین حکومت کے بانی جس کو اپنی زندگی میں یہ معلوم تھا کہ اس کی حکومت ایشیا اور افریقہ سے گزرتی ہوئی یورپ کی سرحدوں تک پہنچ جائے گی، اس نے فرمایا۔

لا نورث ما ترکنا صدقۃ۔ ہم (پیغمبروں) کا کوئی وارث نہیں ہوتا جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے۔ (بخاری و مسلم)

آپ کے اخلاق و کردار اور آپ کے اخلاص و ایثار کی ایک جھلک جو اوپر پیش کی گئی، یہ کچھ مستثنیٰ واقعات نہیں ہیں، بلکہ یہی آپ کی پوری زندگی ہے، آپ کی ساری زندگی اسی قسم کے واقعات کا دوسرا نام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی انسانیت اتنی بلند تھی کہ اگر آپ پیدا نہ ہوتے تو تاریخ کو لکھنا پڑتا کہ اس سطح کا انسان نہ کوئی پیدا ہوا اور نہ کبھی پیدا ہو سکتا۔

ایسے غیر معمولی انسان کے بارے میں یہ عجیب نہیں ہوگا کہ ہم اس کو خدا کا رسول مان لیں، بلکہ یہ عجیب ہوگا کہ ہم اس کے رسول ہونے کا انکار کر دیں، کیونکہ آپ کو رسول مان کر ہم صرف آپ کی معجزاتی شخصیت کی توجیہہ کرتے ہیں، اگر ہم آپ کو رسول نہ مانیں تو ہمارے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں رہتا کہ ان حیرت انگیز اوصاف کا سرچشمہ کیا تھا، جبکہ ساری معلوم تاریخ میں کوئی ایک بھی ایسا انسان پیدا نہیں ہوا، پروفیسر باسورتھ اسمتھ کے یہ الفاظ ایک لحاظ سے حقیقت واقعہ کا اعتراف ہیں، اور دوسرے لحاظ سے وہ سارے انسانوں کو آپ کی رسالت پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں:۔

"محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اپنی زندگی کے آخر میں بھی اپنے لئے اسی منصب کا دعویٰ کیا جس سے انھوں نے اپنے کام کا آغاز کیا تھا، اور میں یہ یقین کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اعلیٰ ترین فلسفہ اور سچی مسیحیت ایک روز یہ تسلیم کرنے پر متفق ہوں گے کہ آپ ایک پیغمبر تھے، خدا کے سچے پیغمبر۔"

Mohammad and Mohammadenism, p. 344

دوسرے پہلو سے رسول کی رسالت کا سب سے بڑا ثبوت وہ کتاب ہے، جس کو اس نے یہ کہہ کر پیش کیا کہ وہ اس کے اوپر خدا کی طرف سے اتری ہے، یہ کتاب بے شمار ایسی خصوصیات سے بھری ہوئی ہے، جو اس کے بارے میں اس امر کا قطعی قرینہ پیدا کرتی ہیں کہ یہ ایک غیر انسانی کلام ہے، یہ خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔

یہ بحث چونکہ مستقل اہمیت کی حامل ہے، اس لئے اس کو میں الگ باب میں بیان کروں گا۔

قرآن - خدا کی آواز

پیغمبر اسلام حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے:

"پیغمبروں میں سے ہر پیغمبر کو اللہ تعالے نے ایسے معجزات دیئے جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے، اور مجھ کو جو معجزہ عطا ہوا ہے، وہ قرآن ہے۔" (بخاری، باب الاعتصام)

یہ ارشاد ہماری تلاش کے صحیح رخ کو متعین کرتا ہے، وہ بتاتا ہے کہ رسول کی رسالت کو پہچاننے کے لئے آج ہمارے پاس جو سب سے بڑا ذریعہ ہے وہ، وہ کتاب ہے جس کو رسول نے یہ کہہ کر پیش کیا تھا کہ وہ اس کے پاس خدا کی طرف سے اتری ہے، قرآن، رسول کا نمائندہ بھی ہے، اور رسول کے رسول برحق ہونے کی دلیل بھی۔

قرآن کی وہ کیا خصوصیات ہیں، جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے اترا ہے، اس کے بہت سے پہلو ہیں، یہاں میں چند پہلوؤں کا مختصراً ذکر کروں گا۔

۱۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی چیز جو قرآن کے طالب علم کو متاثر کرتی ہے، وہ قرآن کا چیلنج ہے، جو چودہ سو برس سے دنیا کے سامنے ہے، مگر آج تک اس کا جواب نہ دیا جا سکا، قرآن میں بار بار یہ اعلان کیا گیا ہے کہ جو لوگ قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کے بارے میں مشتبہ ہیں، اور اس کو محض اپنے جیسے ایک انسان کی تصنیف سمجھتے ہیں، وہ ایسی ایک کتاب بنا کر پیش کریں، بلکہ اس کے جیسی ایک سورہ ہی بنا کر دکھادیں۔

وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ   اپنے بندے پر اپنا جو کلام ہم نے اتارا ہے اگر

عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِہٖ	اس کے (کلام الٰہی ہونے کے) بارے میں تھیں
وَادْعُوْا شُہَدَآءَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ	شبہ ہے تو اس کے جیسی ایک سورہ لکھ کرے آؤ
اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔	اور خدا کے سوا اپنے تمام شہدار کو بھی بلالو۔ اگر
(بقرہ-۲۳)	تم اپنے خیال میں سچے ہو۔

یہ ایک حیرت انگیز دعویٰ ہے، جو ساری انسانی تاریخ میں کسی بھی مصنف نے نہیں کیا اور نہ بقید ہوش وحواس کوئی مصنف ایسا دعویٰ کرنے کی جرأت کر سکتا، کیونکہ کسی بھی انسان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ایک ایسی کتاب لکھ دے جس کے ہم پایہ کتاب دوسرے انسان نہ لکھ سکتے ہوں، ہر انسانی تصنیف کے جواب میں اسی درجہ کی دوسری انسانی تصنیف تیار کی جا سکتی ہے، قرآن کا یہ کہنا کہ وہ ایک ایسا کلام ہے، جیسا کلام انسانی ذہن تخلیق نہیں کر سکتا، اور ڈیڑھ ہزار برس تک کسی انسان کا اس پر قادر نہ ہونا قطعی طور پر ثابت کر دیتا ہے کہ یہ ایک غیر انسانی کلام ہے، یہ خدائی منبع (Divine Origin) سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں، اور جو چیز خدائی منبع سے نکلی ہو اس کا جواب کون دے سکتا ہے۔

تاریخ میں چند مثالیں ملتی ہیں جبکہ اس چیلنج کو قبول کیا گیا، سب سے پہلا واقعہ لبید بن ربیعہ کا ہے جو عربوں میں اپنے قوت کلام اور تیزیٔ طبع کے لئے مشہور تھا، اس نے جواب میں ایک نظم لکھی جو کعبہ کے پھاٹک پر آویزاں کی گئی، اور یہ ایک ایسا اعزاز تھا جو صرف کسی اعلیٰ ترین شخص ہی کو ملتا تھا، اس واقعہ کے جلد ہی بعد کسی مسلمان نے قرآن کی ایک سورہ لکھ کر اس کے قریب آویزاں کر دی، لبید (جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے) جب اگلے روز کعبہ کے دروازہ پر آئے اور سورہ کو پڑھا تو ابتدائی فقروں کے بعد ہی وہ غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے اور اعلان کیا کہ بلاشبہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے، اور میں اس پر ایمان لاتا ہوں[1] — حتیٰ کہ عرب کا یہ مشہور شاعر قرآن کے ادب سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس کی شاعری چھوٹ

[1] *Mohammad the Holy Prophet* by H.G. Sarwar, p.448

گئی، بعد کو ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ان سے اشعار کی فرمائش کی تو انھوں نے جواب دیا۔

"جب خدا نے مجھے بقرہ اور آل عمران جیسا کلام دیا ہے تو اب شعر کہنا میرے لئے زیبا نہیں"۔

(استیعاب ابن عبدالبر، ترجمہ لبید)

دوسرا اس سے زیادہ عجیب واقعہ ابن المقفع کا ہے جس کو نقل کرتے ہوئے ایک مستشرق Wollaston لکھتا ہے۔

"That Muhammad's boast as to the literary excellence of the Quran was not unfounded, is further evidenced by a circumstance , which occourred about a century after the establishment of Islam."

Mohammad, his life and Doctrines, p. 143

یعنی یہ بات کہ قرآن کے اعجاز کلام کے بارے میں محمد کی شیخی غلط نہیں تھی، یہ اس واقعہ سے ثابت ہو جاتا ہے۔ جو اسلام کے قیام کے سو سال بعد پیش آیا۔

واقعہ یہ ہے کہ منکرین مذہب کی ایک جماعت نے یہ دیکھ کر کہ قرآن لوگوں کو بڑی شدت سے متاثر کر رہا ہے، یہ طے کیا کہ اس کے جواب میں ایک کتاب تیار کی جائے، انھوں نے اس مقصد کے لئے ابن المقفع (م ۷۲۷ء) سے رجوع کیا جو اس زمانے کا ایک زبردست عالم، بے مثال ادیب اور غیر معمولی ذہین و طباع آدمی تھا، ابن مقفع کو اپنے اوپر اتنا اعتماد تھا کہ وہ راضی ہو گیا، اس نے کہا کہ میں ایک سال میں یہ کام کر دوں گا البتہ اس نے یہ شرط لگائی کہ اس پوری مدت میں اس کی تمام ضروریات کا مکمل انتظام ہونا چاہئے تاکہ وہ کامل یکسوئی کے ساتھ اپنے ذہن کو اپنے کام میں مرکوز رکھے۔

نصف مدت گزر گئی تو اس کے ساتھیوں نے یہ جاننا چاہا کہ اب تک کیا کام ہوا ہے ـــ وہ جب اس کے پاس گئے تو انھوں نے اس کو اس حال میں پایا کہ وہ بیٹھا ہوا ہے ـــ قلم اس کے ہاتھ میں ہے، گہرے

مطالعہ میں مستغرق ہے، اس مشہور ایرانی ادیب کے سامنے ایک سادہ کاغذ پڑا ہوا ہے، اس کی نشست کے پاس لکھ لکھ کر پھاڑے ہوئے کاغذات کا ایک انبار ہے اور اسی طرح سارے کمرہ میں کاغذات کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ اس انتہائی قابل اور فصیح اللسان شخص نے اپنی بہترین قوت صرف کر کے قرآن کا جواب لکھنے کی کوشش کی، مگر وہ بری طرح ناکام رہا، اس نے پریشانی کے عالم میں اعتراف کیا کہ صرف ایک فقرہ لکھنے کی جدوجہد میں اس کے چھ مہینے گذر گئے، مگر وہ لکھ نہ سکا، چنانچہ ناامید اور شرمندہ ہو کر وہ اس خدمت سے دست بردار ہو گیا۔

اس طرح قرآن کا چیلنج بدستور آج تک قائم ہے، اور صدیوں پر صدیاں گزر گئیں مگر کوئی اس کا جواب نہ دے سکا۔ قرآن یہ ایک حیرت انگیز خصوصیت ہے جو بلا اشتباہ یہ ثابت کرتی ہے کہ یہ مافوق ہستی کا کلام ہے، اگر آدمی کے اندر فی الواقع سوچنے کی صلاحیت ہو تو یہی واقعہ ایمان لانے کے لئے کافی ہے۔

قرآن کے اس معجزانہ کلام کا نتیجہ تھا کہ عرب کے لوگ، جو فصاحت و بلاغت میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، اور جن کو اپنے کلام کی برتری کا اتنا احساس تھا کہ عرب کے سوا بقیہ دنیا کو عجم (گونگا) کہتے تھے، وہ قرآن کے کلام کے آگے جھکنے پر مجبور ہو گئے۔ تمام لوگوں کو اس کے برتر ادب کا اعتراف کرنا پڑا، ضماد ازدی نام کے ایک عرب آپ کے پاس آئے۔ وہ ابھی اسلام نہیں لائے تھے، آپ نے انھیں قرآن کا کچھ حصہ پڑھ کر سنایا، وہ سن کر حیران رہ گئے، ان کی زبان سے بے اختیار یہ فقرہ نکلا۔

"خدا کی قسم میں نے کاہنوں کی بولی، جادوگروں کے منتر اور شاعروں کے قصائد سنے ہیں، مگر تمہارا کلام کچھ اور ہی ہے، یہ تو سمندر تک میں اتر جائے گا۔" (مسلم: باب تخفیف الصلوۃ)

اس طرح کے بے شمار اعترافات ہیں، جو قدیم تاریخ میں بھی موجود ہیں، اور حال کے واقعات میں بھی۔

۲۔ دوسری چیز جس کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں، وہ قرآن کی پیشین گوئیاں ہیں، یہ پیشین گوئیاں حیرت انگیز طور پر بالکل صحیح ثابت ہوئیں۔

تاریخ میں ہمیں بہت سے ایسے ذہین اور حوصلہ مند لوگ ملتے ہیں جنھوں نے اپنے یا دوسرے کے بارے میں پیشین گوئی کی جرأت کی ہے، مگر ہمیں معلوم ہے کہ زمانے نے کبھی ایسے لوگوں کی تصدیق نہیں کی، موافق حالات غیر معمولی صلاحیت، اعوان و انصار کی کثرت اور ابتدائی کامیابیوں نے اکثر لوگوں کو اس دھوکے میں ڈال دیا ہے کہ وہ ایک ایسے انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں، جو عین اس کی مرضی کے مطابق ہے، انھوں نے فوراً ایک یقینی انجام کا دعویٰ کر دیا، مگر تاریخ نے ہمیشہ اس قسم کے دعوؤں کی تردید کی ہے، اس کے برعکس بالکل مخالف اور ناقابل قیاس حالات میں بھی قرآن کے الفاظ اس طرح صحیح ثابت ہوئے کہ ان کی توجیہہ کے لئے تمام انسانی علوم بالکل ناکافی ہیں، ہم انسانی تجربات کی روشنی میں کسی طرح ان کو سمجھ نہیں سکتے۔ ان کی توجیہہ کی واحد صورت صرف یہ ہے کہ ان کو غیر انسانی ہستی کی طرف منسوب کیا جائے۔

نپولین بوناپارٹ اپنے وقت کا عظیم جنرل تھا، اس کی ابتدائی کامیابیاں بتاتی تھیں کہ وہ سیزر اور اسکندر کے لئے بھی ایک قابل رشک فاتح ثابت ہو گا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نپولین کے ذہن میں یہ خیال پرورش پانے لگا کہ وہ تقدیر کا مالک ہے، اس کو اپنے اوپر اتنا اعتماد ہو گیا کہ اپنے قریبی مشیروں تک کے مشورے کو قبول کرنا اس نے چھوڑ دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ کامل غلبہ کے سوا میرا کوئی دوسرا انجام نہیں ہو سکتا۔ مگر اس کا جو انجام ہوا وہ سب کو معلوم ہے، ۱۲ رجون ۱۸۱۵ء کو نپولین اپنی سب سے بڑی فوج لے کر پیرس سے روانہ ہوا کہ دشمن کو اس کے راستے ہی میں ختم کر دے، اس کے چھ دن بعد واٹرلو (بلجیم) میں ڈیوک آف ونگٹن (Duke of Wellington) نے خود اس کو فیصلہ کن شکست دینے میں کامیابی حاصل کی، جو اس وقت برطانیہ، ہالینڈ اور جرمنی کی فوجوں کی قیادت کر رہا تھا، اب نپولین کی ساری امیدیں ختم ہو گئیں، وہ اپنا تخت چھوڑ کر امریکہ کے ارادے سے بھاگ کھڑا ہوا، مگر ابھی ساحل پر پہنچا تھا کہ دشمن کے نگراں دستوں نے اسے پکڑ لیا۔ اور اس کو مجبور کیا کہ وہ ایک برطانوی جہاز پر سوار ہو، اس کے بعد اس کو جلا وطنی کی زندگی گزارنے کے لئے جنوبی اٹلانٹک کے جزیرہ سینٹ ہیلینا پہنچا دیا گیا، جہاں

وہ تنہائی اور تلخ حالات میں پڑا پڑا ۵ مئی ۱۸۲۱ء کو مرگیا۔

مشہور کمیونسٹ مینی فسٹو جو ۱۸۴۸ء میں شائع ہوا، اس میں سب سے پہلے جس ملک میں اشتراکی انقلاب کی امید ظاہر کی گئی تھی، وہ جرمنی ہے، مگر ایک سو بیس ۱۲۰ سال گزرنے کے بعد بھی جرمنی اب تک اس "انقلاب" سے ناآشنا ہے، مئی ۱۸۴۹ء میں کارل مارکس نے لکھا تھا "سرخ جمہوریت پیرس کے اوپر سے جھانک رہی ہے" اس پیشین گوئی کو ایک صدی سے زیادہ مدت گزر گئی، مگر ابھی تک پیرس کے اوپر سرخ جمہوریت کا آفتاب نہیں نکلا، اڈولف ہٹلر نے ۱۴ مارچ ۱۹۳۶ء کو میونخ کی شہور تقریر میں کہا تھا۔

"میں اپنے راستہ پر اعتماد کے ساتھ چل رہا ہوں کہ غلبہ میرے حق میں مقدر ہو چکا ہے" [1]

مگر ساری دنیا جانتی ہے کہ جرمنی کے اس عظیم ڈکٹیٹر کے حق میں جو چیز مقدر تھی وہ یہ کہ وہ شکست کھائے اور خودکشی کرکے اپنی جان دے، خود اپنے ملک میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ جنوری ۱۹۵۴ء میں مدوراس میں کمیونسٹ پارٹی کی تیسری کانگرس کے موقع پر کمیونسٹ لیڈر مسٹر پی، سی، جوشی نے اعلان کیا تھا کہ "ہندوستان کے آئندہ عام الیکشن میں کمیونسٹ پارٹی ٹراونکور، کوچین (کیرالا) مدراس، آندھرا، مغربی بنگال اور آسام میں اپنی وزارت بنائے گی"۔ اس کے بعد کئی الیکشن آئے اور چلے گئے، مگر حالات نے ان الفاظ کی تصدیق نہیں کی۔ اس طرح کی بے شمار مثالوں کے ہجوم میں صرف کتاب الٰہی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس نے جس جس چیز کی پیشین گوئی کی وہ حرف بحرف پوری ہوئی ـــــ یہ واقعہ اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہے کہ یہ کلام ایسے مافوق ذہن سے نکلا ہے جس کے قبضہ میں حالات کی باگ ڈور ہے اور جو ازل سے ابد تک کی خبر رکھتا ہے۔

یہاں میں صرف دو پیشین گوئیوں کا ذکر کروں گا، ایک خود پیغمبر اسلام کا غلبہ، دوسرے رومیوں کی دوبارہ فتح کی پیشین گوئی۔

---

[1] A Study uf History (Abridgment) p.447

۱۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسلام کی دعوت شروع کی تو تقریباً تمام عرب آپ کا مخالف ہو گیا ایک طرف مشرک قبائل تھے، جو آپ کے جانی دشمن ہو گئے، دوسری طرف یہودی سرمایہ دار تھے، جو ہر قیمت پر آپ کو ناکام بنا دینے کا فیصلہ کر چکے تھے، تیسری طرف منافقین تھے، جو بظاہر مسلمان بنے ہوئے تھے، مگر ان کا مقصد یہ تھا کہ آپ کی جماعت میں گھس کر آپ کی تحریک کو اندر سے ڈائنامیٹ کریں، اس طرح طاقت، سرمایہ اور اندرونی سازش ــــــ ہر طرف مخالفتوں کے طوفان میں آپ اس طرح اپنی تحریک چلا رہے تھے کہ تھوڑے سے غلاموں اور کمزور لوگوں کے سوا کوئی آپ کا ساتھی نہ تھا، مکہ کے سربرآوردہ لوگوں میں سے گنتی کے چند آدمی جو آپ کا ساتھ دینے کے لئے نکلے ان کا بھی حال یہ ہوا کہ آپ کی طرف آتے ہی وہ اپنی برادری سے کٹ گئے، اور ان کی قوم ان کی بھی اسی طرح دشمن ہو گئی جس طرح وہ خدا کے رسول کی دشمن تھی۔

یہ تحریک یوں ہی چلتی رہی، یہاں تک کہ حالات اس قدر شدید ہو گئے کہ آپ اور آپ کے ساتھیوں کو اپنا وطن چھوڑ کر دوسرے علاقوں کی طرف ہجرت کر جانا پڑا، اس طرح آپ اور آپ کے ساتھی جو پہلے ہی نہتے اور کمزور تھے، مدینے میں اس حالت میں جمع ہوئے کہ اپنے وطن میں جو کچھ ان کے پاس تھا وہ بھی چھن چکا تھا، مدینے میں ان لوگوں کی بے کسی کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اپنے وطن کو چھوڑ کر مدینے میں آپ کے جو ساتھی جمع ہوئے تھے، ان میں ایسے لوگ بھی تھے، جن کے رہنے کے لئے کوئی باقاعدہ مکان نہیں تھا، وہ چھپر پڑے ہوئے ایک چبوترے پر زندگی گزارتے تھے، اسی مناسبت سے ان کا نام "اصحاب صفہ" پڑ گیا تھا، اس چبوترے پر مختلف اوقات میں جو لوگ رہے، ان کی تعداد تقریباً چار سو بتائی جاتی ہے، حضرت ابوہریرہ کا بیان ہے کہ میں نے اصحاب صفہ میں سے ستر آدمیوں کو دیکھا ہے جن میں سے ہر شخص کا حال یہ تھا کہ اس کے پاس یا تو صرف ایک تہبند تھی، یا صرف ایک چادر، وہ اس کو اپنی گردن میں باندھ لیتا تھا، اور وہ اس کی پنڈلی تک لٹکتا رہتا تھا، حضرت

ابوہریرہ اس زمانے کا خود اپنا حال بیان کرتے ہیں کہ میں مسجد نبوی میں خاموش لیٹا رہتا تھا، اور لوگ سمجھتے تھے کہ میں بیہوش ہوں، حالانکہ حقیقت صرف یہ تھی کہ مسلسل فاقے کی وجہ سے میں نڈھال ہو جاتا تھا، اور مسجد میں جا کر لیٹ رہتا تھا۔ (ترمذی)

چند انسانوں کا یہ بے سروسامان قافلہ مدینے کی زمین پر اس طرح پڑا ہوا تھا کہ ہر آن یہ خطرہ تھا کہ چاروں طرف اس کے پھیلے ہوئے دشمن اس کو اچک لے جائیں گے۔ مگر خدا کی طرف سے بار بار آپ کو یہ بشارت آتی تھی کہ تم ہمارے نمائندے ہو اور تمھیں کوئی زیر نہیں کر سکتا (کتب اللہ لأغلبن انا ورسلی) ساری مخالفتوں کے علی الرغم اللہ تم کو غالب کر کے رہے گا۔

یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ	یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں
وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ۝	سے بجھا دیں اور اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ اپنی روشنی
ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی	کو مکمل کر کے رہے گا، خواہ منکروں کو یہ کتنا ہی
وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ	ناگوار ہو وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت
کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ۔	اور دین حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ اس کو تمام
(صف۔ ۸، ۹)	دینوں پر غالب کر دے، خواہ شرک کرنے
	والوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

اس دعوے کو تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ سارا عرب آپ کے قدموں کے نیچے آگیا، تھوڑے سے نہتے اور بے سروسامان لوگ ان پر غالب آگئے جو تعداد میں بہت زیادہ تھے، وقت جن کا ساتھ دے رہا تھا اور جن کے پاس ہتھیار اور سازوسامان کا زبردست ذخیرہ موجود تھا۔

مادی اصطلاحات میں اس بات کی کوئی توجیہہ نہیں کی جا سکتی کہ آپ کو عین اپنی پیشین گوئی کے مطابق عرب کے لوگوں اور ہمسایہ ملکوں پر کیسے اتنا زبردست غلبہ حاصل ہو گیا، اس کی صرف ایک ہی

توجیہہ ممکن ہے، وہ یہ کہ آپ خدا کے نمائندے تھے، خدا نے اپنی مدد سے آپ کو آپ کے دشمنوں کے مقابلے میں غالب کیا اور آپ کے مشن کو اس حد تک کامیاب کیا کہ آپ کے دشمن آپ کے ساتھی بن گئے، غیر معمولی مخالفت اور زبردست دشمنوں کے مقابلے میں نبی امی کا عین اپنے دعوے کے مطابق کامیاب ہونا اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ آپ کائناتی طاقت کے نمائندے تھے، اگر آپ محض ایک انسان ہوتے تو کبھی یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ کے الفاظ تاریخ بن جائیں، ایسی تاریخ جس کی مثال سارے انسانی واقعات میں کوئی ایک بھی نہیں، جے، ڈبلیو، ایچ اسٹوبرٹ (J.W.H. Stobart) کے الفاظ میں "آپ کے پاس جتنے کم ذرائع تھے، اور جو وسیع اور مستقل کارنامہ آپ نے انجام دیا، اس کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ساری انسانی تاریخ میں اتنا نمایاں طور پر درخشاں نام اور کوئی نظر نہیں آتا جتنا نبی عربی کا ہے"[1]

یہ آپ کے نمائندۂ الہٰی ہونے کی ایسی حیرت انگیز دلیل ہے کہ سر ولیم میور (William Muir) جیسے شخص کو بھی بالواسطہ طور پر اس کا اعتراف کرنا پڑا ہے۔

> "محمد نے دشمنوں کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا، انھیں مٹھی بھر آدمیوں کے ساتھ دن رات اپنی کامیابی کا انتظار رہتا تھا، بظاہر بالکل غیر محفوظ، بلکہ یوں کہئے کہ شیر کے منھ میں رہ کر وہ ہمت دکھائی کہ اس کی نظیر اگر کہیں مل سکتی ہے تو صرف بائبل میں جہاں ایک نبی کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے ایک موقع پر خدا سے کہا تھا کہ —— صرف میں ہی باقی رہ گیا ہوں"
>
> *Life of Mohammad*, p. 221

۲۔ قرآن کی دوسری پیشین گوئی جس کا میں یہاں ذکر کرنا چاہتا ہوں، وہ رومیوں کا ایرانیوں پر غلبہ ہے جو قرآن کی تیسویں سورہ (روم) میں وارد ہوئی ہے۔

"غُلِبَتِ الرُّومُ فِي أَدْنَى الْأَرْضِ وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ"[2]

---

[1] *Islam and its Founder*, p. 228 [2] الروم - ۳۲

جزیرہ نمائے عرب کے مشرق میں خلیج فارس کے دوسرے ساحل پر ایرانی حکومت قائم تھی اور مغرب میں بحر احمر کے کناروں سے لے کر اوپر بحر اسود تک وہ سلطنت تھی، جو تاریخ میں سلطنت روم کے نام سے مشہور ہے، اول الذکر کا دوسرا نام ساسانی سلطنت اور موخر الذکر کا بازنطینی سلطنت ہے، ان دونوں حکومتوں کی سرحدیں عرب کے شمال میں عراق کے مشہور دریاؤں دجلہ و فرات پر آکر ملتی تھیں، یہ دونوں اپنے زمانے کی طاقت ور ترین سلطنتیں تھیں، رومی سلطنت کی تاریخ مورخ گبن کے بیان کے مطابق دوسری صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے اور اس کو اپنے وقت کی مہذب ترین سلطنت کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

روم کے زوال پر جتنا لکھا گیا ہے، اتنا کسی تہذیب کے خاتمے پر نہیں لکھا گیا[1] اور اگرچہ کوئی ایسی کتاب نہیں ہو سکتی جو دوسری تمام کتابوں سے آدمی کو مستغنی کر دے، تاہم مجموعی اعتبار سے اس عنوان پر سب سے زیادہ مفصل اور معتمد مواد اڈورڈ گبن (Edward Gibbon) کی مشہور کتاب ہے جس کا نام ہے:-

The History of the Decline and Fall of the Roman Empire

اس کتاب کی پانچویں جلد کے دوسرے باب میں قابل مصنف نے اس دور کے واقعات قلم بند کئے ہیں، جو اس وقت ہمارا موضوع بحث ہے، روم کے ایک سابق بادشاہ قسطنطین نے ۳۲۵ء میں مسیحیت قبول کر کے اس کو سرکاری مذہب کی حیثیت دے دی تھی، چنانچہ روم کی بیشتر آبادی اب حضرت عیسیٰ کی پیرو تھی، اس کے مقابلے میں ایرانی سورج دیوتا کے پرستار تھے، نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے روم پر جس بادشاہ کی حکومت تھی، اس کا نام ماریس (Maurice) تھا، ماریس کی نااہلی اور بدانتظامی کی وجہ سے آپ کو نبوت ملنے سے آٹھ سال قبل ۶۰۲ء میں اس کی فوج نے اس کے خلاف بغاوت کر دی، اس بغاوت کی قیادت ایک فوجی کپتان فوکاس (Phocas) نے کی تھی، بغاوت کامیاب ہوگئی، اور فوکاس روم کے شہنشاہ کی جگہ تخت پر قابض ہو گیا ـــ اس نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد شہنشاہ روم ماریس اور اس کے خاندان کو نہایت

---

[1] *Western Civilisation*. p. 210

بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا۔

فوکاس نے اپنی ہمسایہ سلطنت ایران کو ایک سفیر بھیج کر نئی تخت نشینی کی اطلاع دی، اس وقت ایران کے تخت پر نوشیرواں عادل کا لڑکا خسرو پرویز (Chosroes II) تھا، خسرو پرویز کو ۹۱-۵۹۰ء میں اندرونی سازش اور بغاوت کی وجہ سے اپنے ملک سے فرار ہونا پڑا تھا، اس زمانے میں مقتول رومی شہنشاہ ماریس نے اس کو اپنے علاقہ میں پناہ دی تھی، اور دوبارہ قبضہ حاصل کرنے کے سلسلے میں اس کی مدد کی تھی، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھیں دنوں قسطنطنیہ کے زمانۂ قیام میں خسرو نے ماریس کی لڑکی سے شادی کر لی تھی اور اس رشتہ کی بنا پر ماریس کو وہ اپنا باپ کہتا تھا، چنانچہ جب خسرو کو رومی انقلاب کی خبر ملی تو وہ سخت برہم ہوا، اس نے رومی سفیر کو قید کرا دیا، اور نئی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد فوراً اس نے اپنی فوجوں کے ذریعے روم پر چڑھائی کر دی، ۶۰۳ء میں اس کی فوجیں دریائے فرات کو پار کر کے شام کے شہروں میں داخل ہو گئیں — فوکاس اپنی نااہلی کی وجہ سے اس غیر متوقع حملہ کو روکنے میں کامیاب نہ ہوا، ایرانی فوجیں بڑھتی رہیں، یہاں تک کہ انطاکیہ کو فتح کرتے ہوئے یروشلم پر قابض ہو گئیں، ایرانی سلطنت کے حدود فرات سے پار کر کے یکایک وادئ نیل تک وسیع ہو گئے، سابقہ رومی سلطنت کے مذہبی داروگیر کی وجہ سے چرچ کے مخالف فرقے نسطوری اور یعقوبی نیز یہودی پہلے سے رومی حکومت سے ناراض تھے، اب انھوں نے روم دشمنی میں نئے فاتحین کا ساتھ دیا، اس چیز نے خسرو کی کامیابی کو بہت آسان بنا دیا۔

فوکاس کی ناکامی دیکھ کر بعض اعیان سلطنت نے افریقی مقبوضہ کے رومی گورنر کے یہاں خاموش پیغام بھیجا کہ وہ ملک کو بچانے کی کوشش کرے، اس نے اپنے لڑکے ہرقل (Heraclius) کو اس مہم پر روانہ کیا، ہرقل سمندر کے راستہ سے فوج لے کر افریقہ سے روانہ ہوا، اور یہ ساری کارروائی اس قدر رازداری کے ساتھ انجام پائی کہ فوکاس کو اس وقت تک اس کی خبر نہیں ہوئی جب تک اس نے اپنے محل سے سمندر میں آتے ہوئے جہازوں کے نشانات نہیں دیکھ لئے، ہرقل معمولی لڑائی کے بعد دارالسلطنت پر قابض

ہو گیا، اور فوکاس قتل کر دیا گیا۔

ہرقل نے فوکاس کو تو ختم کر دیا، مگر وہ ایرانی سیلاب کو روکنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ۶۱۶ء تک رومی دارالسلطنت سے باہر اپنی شہنشاہی کا تمام مشرقی اور جنوبی حصہ کھو چکے تھے، عراق، شام، فلسطین، مصر، ایشیائے کوچک، ہر جگہ صلیبی علم کے بجائے درفش کاویانی لہرا رہا تھا، رومی سلطنت قسطنطنیہ کی چہار دیواری میں محدود ہو کر رہ گئی تھی، محاصرہ کی وجہ سے تمام راستے بند تھے، چنانچہ شہر میں قحط اور وبائی امراض نے پھیل کر مزید مصیبت پیدا کر دی، رومی سلطنت کے عظیم الشان درخت کا صرف تنا باقی رہ گیا تھا، اور وہ بھی خشک ہو رہا تھا، خود قسطنطنیہ کے اندر دشمن کے گھس آنے کا خوف تمام آبادی پر اس قدر چھایا ہوا تھا کہ تمام کاروبار بند تھے، وہ پبلک مقامات جہاں رات دن چہل پہل رہتی تھی، اب سنسان پڑے ہوئے تھے۔

آتش پرست حکومت نے رومی علاقہ پر قبضہ کرنے کے بعد مسیحیت کو مٹانے کے لئے شدید ترین مظالم شروع کئے، مذہبی شعائر کی توہین شروع کی گئی، گرجاگھر مسمار کر دیئے گئے، تقریباً ایک لاکھ عیسائیوں کو بے گناہ قتل کر دیا گیا، ہر جگہ آتش کدے تعمیر کئے گئے، اور مسیح کے بجائے آگ اور سورج کی جبری پرستش کو رواج دیا گیا، مقدس صلیب کی اصل لکڑی جس کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ اس پر مسیح نے جان دی تھی، وہ چھین کر مدائن پہنچا دی گئی۔

مورخ گبن کے الفاظ میں:۔

"اگر خسرو کے مقاصد واقعی نیک اور درست ہوتے تو وہ باغی فوکاس کے خاتمہ کے بعد رومیوں سے اپنے جھگڑے کو ختم کر دیتا اور افریقی فاتح کا اپنے بہترین ساتھی کی حیثیت سے استقبال کرتا جس نے نہایت خوبی کے ساتھ اس کے محسن ماریس کا انتقام لے لیا تھا، مگر جنگ کو جاری رکھ کر اس نے اپنے اصل کردار کو نمایاں کر دیا۔" (ص ۷۴)



جزیرۃ العرب اور اس کے پڑوسی ممالک

اس وقت ایرانی شہنشاہیت اور رومی سلطنت میں کیا فرق پیدا ہوچکا تھا اور ایرانی فاتح اپنے کو کتنا بڑا سمجھنے لگا تھا، اس کا اندازہ خسرو پرویز کے اس خط سے ہوتا ہے، جو اس نے بیت المقدس سے ہرقل کو لکھا تھا:۔

"سب خداؤں سے بڑا خدا، تمام روئے زمین کے مالک خسرو کی طرف سے اس کے کمینہ اور بے شعور بندے ہرقل کے نام۔ تو کہتا ہے کہ تجھے اپنے خدا پر بھروسہ ہے، کیوں نہ تیرے خدا نے یروشلم کو میرے ہاتھ سے بچا لیا۔"

ان حالات نے قیصر روم کو بالکل مایوس کردیا، اور اس نے طے کرلیا کہ اب وہ قسطنطنیہ چھوڑ کر بحری راستہ سے اپنے جنوبی افریقہ کی ساحلی قیام گاہ میں چلا جائے جو قرطاجنہ (Carthage) موجودہ تیونس میں واقع تھی، اب اس کے سامنے ملک کو بچانے کے بجائے اپنی ذات کو بچانے کا مسئلہ تھا ــــ شاہی کشتیاں محل کے خزانوں سے لادی جا چکی تھیں، مگر عین وقت پر رومی کلیسا کے بڑے پادری نے اس کو مذہب کا واسطہ دے کر روکنے میں کامیابی حاصل کرلی، وہ اس کو سینٹ صوفیا کی قربان گاہ پر لے گیا، اور اس کو آمادہ کیا کہ وہاں وہ اس بات کا عہد کرے کہ وہ اپنی اس رعایا کے ساتھ جیئے گا یا مرے گا جس کے ساتھ خدا نے اس کو وابستہ کیا ہے" (صفحہ ۷۵) اسی دوران میں ایرانی جنرل سین Saine نے تجویز کیا کہ ہرقل ایک صلح کا قاصد شہنشاہ ایران کی خدمت میں روانہ کرے، اس کو ہرقل اور اس کے مشیروں نے بڑی خوشی سے قبول کیا، مگر جب شہنشاہ ایران خسرو پرویز کو اس کی خبر پہنچی تو اس نے کہا:۔

"مجھ کو یہ نہیں، بلکہ خود ہرقل زنجیروں میں بندھا ہوا میرے تخت کے نیچے چاہئے، میں رومی حکمران سے اس وقت تک صلح نہیں کروں گا، جب تک وہ اپنے صلیبی خدا کو چھوڑ کر ہمارے سورج دیوتا کی پرستش نہ کرے۔" (صفحہ ۷۶)

تاہم چھ سالہ لڑائی نے بالآخر ایرانی حکمران کو مائل کیا کہ وہ فی الحال کچھ شرائط پر صلح کرے، اس نے شرط پیش کی۔

"ایک ہزار ٹالنٹ[1] سونا، ایک ہزار ٹالنٹ چاندی، ایک ہزار ریشمی تھان، ایک ہزار گھوڑے ایک ہزار کنواری لڑکیاں"۔

گبن ان شرائط کو بجا طور پر شرمناک شرائط Ignominious Terms کہتا ہے، ہرقل یقیناً ان شرائط کو قبول کر لیتا، مگر جتنی کم مدت میں اور جس چھوٹے سے لٹے ہوئے علاقہ سے اس کو ان قیمتی شرائط کی تکمیل کرنی تھی، اس کے مقابلے میں اس کے لئے زیادہ قابل ترجیح بات یہ تھی کہ وہ انھیں ذرائع کو دشمن کے خلاف آخری حملہ کی تیاری کے لئے استعمال کرے۔

ایک طرف یہ واقعات ہو رہے تھے، دوسری طرف ایران و روم کے درمیان عرب کے مرکزی مقام "مکہ" میں ان واقعات نے ایک اور کشمکش پیدا کر دی تھی، ایرانی سورج دیوتا کو مانتے تھے، اور آگ کی پرستش کرتے تھے، اور رومی وحی و رسالت کے ماننے والے تھے، اس لئے نفسیاتی طور پر اس جنگ میں مسلمانوں کی ہمدردیاں رومی عیسائیوں کے ساتھ تھیں اور مشرکین مظاہر پرست ہونے کی وجہ سے مجوسیوں سے اپنا مذہبی رشتہ جوڑتے تھے، اس طرح روم و ایران کی کشمکش اس کشمکش کا ایک خارجی نشان بن گئی جو مکہ میں اہل اسلام اور کفار و مشرکین کے درمیان جاری تھی، دونوں گروہ سرحد پار کی اس جنگ کے انجام کو خود اپنی باہمی کشمکش کے انجام کی ایک علامت سمجھنے لگے، چنانچہ ۶۱۶ء میں جب ایرانیوں کا غلبہ نمایاں ہو گیا اور رومیوں کے تمام مشرقی علاقے ایرانیوں کے قبضہ میں چلے گئے، اور اس کی خبریں مکہ پہونچیں تو اسلام کے مخالفین نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہنا شروع کیا کہ دیکھو ہمارے بھائی تمہارے جیسا مذہب رکھنے والوں پر غالب آگئے ہیں، اسی طرح اپنے ملک میں بھی ہم تم کو اور تمہارے دین کو مٹا کر رکھ دیں گے، مکہ کے مسلمان جس بے بسی اور کمزوری کی حالت میں تھے، اس میں یہ الفاظ ان کے لئے زخم پر نمک کا کام کرتے تھے، عین اس حالت میں پیغمبر خدا کی زبان سے یہ الفاظ جاری کئے گئے۔

---

[1] (Talent) یونانیوں اور رومیوں کا ایک قدیم وزن۔

غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ	رومی قریب کی زمین میں مغلوب ہو گئے ہیں
مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ فِیْ بِضْعِ	مگر مغلوب ہونے کے بعد چند سال میں پھر وہ
سِنِیْنَ ۔ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ	غالب آجائیں گے، پہلے اور پیچھے سب اختیار
وَیَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰهِ	خدا کے ہاتھ میں ہے، اور اس دن مسلمان
یَنْصُرُ مَنْ یَّشَآءُ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ	خدا کی مدد سے خوش ہوں گے وہ جس کی چاہتا
وَعْدَ اللّٰهِ لَا یُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ	ہے مدد کرتا ہے وہ غالب اور مہربان ہے
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۔	خدا کا وعدہ ہے خدا اپنے وعدہ کے خلاف
(روم ۲-۶)	نہیں کرتا۔

"اس وقت جب کہ یہ پیشین گوئی کی گئی" گبن لکھتا ہے "کوئی بھی پیشگی خبر اتنی بعید از وقوع نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ ہرقل کے ابتدائی بارہ سال رومی سلطنت کے خاتمہ کا اعلان کر رہے تھے" (صفحہ ۴۴) مگر ظاہر ہے کہ یہ پیشین گوئی ایک ایسی ذات کی طرف سے کی گئی تھی، جو تمام ذرائع و وسائل پر تنہا قدرت رکھتا ہے، اور انسانوں کے دل جس کی مٹھی میں ہیں، چنانچہ ادھر خدا کے فرشتے نے ایک امی کی زبان سے یہ خبر دی اور ادھر ہرقل قیصر روم میں ایک انقلاب آنا شروع ہو گیا، گبن لکھتا ہے۔

"تاریخ کے نمایاں کرداروں میں سے ایک غیر معمولی کردار وہ ہے، جو ہرقل کے اندر ہم دیکھتے ہیں اپنے لمبے دور حکومت کے ابتدائی اور آخری سالوں میں یہ شہنشاہ سستی، عیاشی اور اوہام کا بندہ دکھائی دیتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی رعایا کی مصیبتوں کا ایک بےحس اور نامرد تماشائی ہے، مگر صبح و شام کا بے رونق کہر دوپہر کے سورج سے کچھ دیر کے لئے چھٹ جاتا ہے، یہی حال ہرقل کا ہوا، محل کا آرکے ڈیس[1] Arcadius یکایک میدان جنگ کا سیزر (Caesar) بن گیا[2]، اور روم کی عزت چھ جرأت مندانہ مہموں کے ذریعہ دوبارہ

---

[1] آرکے ڈیس (۴۰۸-۳۷۸) رومی سلطنت کا ایک تاجدار جو ۳۹۵ء میں تخت نشین ہوا۔
[2] جولیس سیزر (۴۴-۱۰۲ ق م) عظیم رومی فوجی اور سیاست داں۔

حاصل کرلی گئی، یہ رومی مورخین کا فرض تھا کہ وہ حقیقت سے پردہ اٹھاتے اور اس کی اس خواب اور بیداری کے وجوہ بیان کرتے، اتنے دنوں بعد اب ہم یہی قیاس کر سکتے ہیں کہ اس کے پیچھے کوئی سیاسی اسباب نہیں تھے، بلکہ یہ زیادہ تر اس کے شخصی جذبے کا نتیجہ تھا، اسی کے تحت اس نے اپنی تمام دلچسپیاں ختم کردیں، حتیٰ کہ اپنی بھانجی (Martina) کو بھی چھوڑ دیا جس سے اس کو اس قدر تعلق تھا کہ محرم ہونے کے باوجود اس کے ساتھ اس نے شادی کرلی تھی:

Gibbon, Vol. V. p. 76-77

وہی ہرقل جس کی ہمت پست ہو چکی تھی، اور جس کا دماغ اس سے پہلے کچھ کام نہیں کرتا تھا، اب اس نے ایک نہایت کامیاب منصوبہ بنایا، قسطنطنیہ میں بڑے عزم وانہماک کے ساتھ جنگی تیاریاں شروع ہوگئیں، تاہم اس وقت صورت حال ایسی تھی کہ ۶۲۲ء میں جب ہرقل اپنی فوجیں لے کر قسطنطنیہ سے روانہ ہوا تو لوگوں نے سمجھا کہ دنیا رومن امپائر کا آخری لشکر دیکھ رہی ہے۔

ہرقل جانتا تھا کہ ایرانی حکومت سمندری طاقت میں کمزور ہے، اس نے اپنے سمندری بیڑے کو پشت سے حملہ کے لئے استعمال کیا، اس نے اپنی فوجیں بحر اسود کے راستے سے گزار کر آرمینیا میں اتار دیں اور وہاں عین اس مقام پر ایرانیوں کے اوپر ایک بھرپور حملہ کیا، جہاں سکندر اعظم نے اس وقت کی ایرانی سلطنت کو شکست دی تھی جب اس نے شام سے مصر تک اپنا مشہور مارچ کیا تھا، ایرانی اس غیر متوقع حملہ سے گھبرا گئے اور ان کے قدم اکھڑ گئے، مگر ابھی وہ ایشیائے کوچک میں زبردست فوج رکھتے تھے، وہ دوبارہ اس فوج سے حملہ کرتے اگر ہرقل نے اس کے بعد شمال کی جانب سمندر سے اسی قسم کی دوسری غیر متوقع چڑھائی نہ کی ہوتی، پھر وہ سمندر کے راستہ سے قسطنطنیہ واپس آیا، آواریوں (Avars) سے ایک معاہدہ کیا اور ان کی مدد سے ایرانیوں کو ان کے دارالسلطنت کے گرد روک دیا، ان دو حملوں کے بعد اس نے مزید تین مہمیں جاری کیں — ۶۲۳ء میں، ۶۲۴ء میں اور ۶۲۵ء میں یہ مہمیں بحر اسود کے جنوبی ساحل سے

حملہ آور ہو کر ایرانی قلمرو میں گھسیں اور میسوپوٹامیا تک پہنچ گئیں، اس کے بعد ایرانی جارحیت کا زور ٹوٹ گیا، اور تمام رومی علاقے ایرانی فوجوں سے خالی ہو گئے، اب ہرقل خود ایرانی شہنشاہیت کے قلب پر حملہ کرنے کی پوزیشن میں تھا، تاہم آخری فیصلہ کن جنگ دجلہ کے کنارے نینوا کے مقام پر دسمبر ۶۲۷ء میں ہوئی۔

اب خسرو کی ہمت چھوٹ گئی تھی، وہ اپنے محبوب محل "دستگرد" سے بھاگنے کی تیاری کرنے لگا، مگر اسی دوران میں خود اس کے محل کے اندر اس کے خلاف بغاوت ہو گئی، اس کے لڑکے شیرویہ نے اس کو گرفتار کر کے ایک تہہ خانے میں بند کر دیا جہاں وہ پانچویں دن بیکسی کی حالت میں مر گیا، اس کے اٹھارہ لڑکوں کو اس کی آنکھ کے سامنے قتل کر دیا گیا، مگر اس کا یہ لڑکا بھی آٹھ مہینے تخت پر رہ سکا، اس کے بعد دوسرے شہزادے نے اس کو قتل کر کے تاج پر قبضہ کر لیا، اس طرح شاہی خاندان کے اندر آپس میں تلواریں چلنا شروع ہو گئیں، یہاں تک کہ چار سال میں نو بادشاہ بدلے گئے، ان حالات میں ظاہر ہے کہ از سر نو رومیوں کا مقابلہ کرنے کا کوئی سوال نہیں تھا، خسرو پرویز کے بیٹے قباد ثانی نے رومی مقبوضات سے دست بردار ہو کر صلح کر لی، مقدس صلیب کی اصل لکڑی واپس کر دی گئی، اور مارچ ۶۲۸ء میں فاتح ہرقل اس شان سے قسطنطنیہ واپس آیا کہ اس کے رتھ کو چار ہاتھی کھینچ رہے تھے، اور بے شمار لوگ دارالسلطنت کے باہر لیمپوں اور زیتون کی شاخوں کو لئے ہوئے اپنے ہیرو کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ (صفحہ ۹۴)

اس طرح قرآن نے رومیوں کے دوبارہ غلبہ کے متعلق جو پیشین گوئی کی تھی وہ ٹھیک اپنے وقت پر (دس سال کے اندر) مکمل طور پر پوری ہو گئی۔

گبن نے اس پیشین گوئی پر حیرت کا اظہار کیا ہے، مگر اسی کے ساتھ اس کی اہمیت گھٹانے کے لئے اس نے بالکل غلط طور پر اس کو خسرو کے نام آپ کے دعوت نامے کے ساتھ جوڑ دیا ہے، وہ لکھتا ہے۔

> "ایرانی شہنشاہ نے جب اپنی فتح مکمل کر لی تو اس کو مکہ کے ایک گمنام شہری کا خط ملا جس میں اس کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ محمدؐ کو خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے تسلیم کرے، اس نے دعوت کو نامنظور کر دیا

اور خط کو چاک کر دیا، رسول عربی کو جب خبر ملی تو انھوں نے کہا "خدا اسی طرح خسرو کی سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کردے گا اور اس کی طاقت کو برباد کردے گا" مشرق کی دو عظیم سلطنتوں کے عین کنارے بیٹھے ہوئے محمد ان دونوں حکومتوں کی باہمی تباہی سے اندر ہی اندر خوش ہوتے رہے اور ایرانی فتوحات کے عین وسط میں انھوں نے یہ پیشین گوئی کرنے کی جرأت کی کہ چند سال کے بعد فتح دوبارہ رومیوں کے جھنڈے کی طرف لوٹ آئے گی، اس وقت جبکہ یہ پیشین گوئی کی گئی، کوئی بھی پیشگی خبر اتنی بعید از وقوع نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ ہرقل کے ابتدائی بارہ سال رومی شہنشاہیت کے خاتمہ کا اعلان کر رہے تھے۔"

(Gibbon. Vol. V p.73-74)

مگر اسلامی تاریخ کا ہر مورخ جانتا ہے کہ اس پیشین گوئی کا خسرو کے نام دعوت نامے سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ شہنشاہ ایران کے نام اسلام کا دعوت نامہ ہجرت کے ساتویں سال صلح حدیبیہ کے بعد بھیجا گیا ہے، جو سن عیسوی کے لحاظ سے ۶۲۸ء ہوتا ہے، جبکہ پیشین گوئی ہجرت سے پہلے مکہ میں ۶۱۶ء میں نازل ہوئی تھی[1]۔

۳۔ قرآن کی تیسری خصوصیت کو جس میں اس کی صداقت کے ثبوت میں پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ واقعہ ہے کہ قرآن باوجودیکہ علمی ترقی سے بہت پہلے نازل ہوا، اس کی کوئی بات آج تک غلط ثابت نہ ہو سکی، اگر یہ صرف ایک انسانی کلام ہوتا تو ایسا ہونا ناممکن تھا۔

چین کے نوجوان طلبہ کی ایک جماعت جو حکومت کے زیر اہتمام کیلی فورنیا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہی تھی، ان میں سے تقریباً بارہ افراد نے برکلے کے گرجا گھر میں جا کر پادری سے کہا کہ وہ ان کے لئے اتوار کے ایک کلاس کا انتظام کرے، چینی نوجوانوں نے نہایت صفائی سے کہا کہ انھیں ذاتی طور پر عیسائیت سے کوئی

---

[1] اعجاز قرآن پر انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کے مندرجہ ذیل حصے قابل ملاحظہ ہیں۔

مقالہ (Quran) ج ۱۰ ص ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۵۔

دلچسپی نہیں ہے، اور نہ وہ خود عیسائی بننا چاہتے، البتہ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس مذہب نے امریکی تمدن پر کیا اور کتنے اثرات ڈالے ہیں، پادری نے اس جماعت کی ہفتہ وار تعلیم کے لئے ریاضیات اور فلکیات کے ایک عالم (Peter W. Stoner) کو مقرر کیا، اس واقعہ کے چار مہینے بعد تمام نوجوانوں نے عیسائیت قبول کرلی، اس غیر معمولی تبدیلی کی وجہ کیا تھی، اس کو خود معلم کی زبان سے سنئے :۔

"میرے سامنے سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ اس طرح کے لوگوں کے سامنے مذہب کی کون سی بات رکھی جائے، کیونکہ یہ نوجوان بائبل پر سرے سے ایمان ہی نہیں رکھتے، بائبل کی محض رواجی تعلیم بے فائدہ معلوم ہوتی تھی، اس وقت میرے ذہن میں ایک خیال آیا، میں نے اپنی تعلیم کے زمانے میں بائبل کے پہلے باب (کتاب پیدائش) اور سائنس میں بہت قریبی مناسبت پائی تھی میں نے فیصلہ کیا کہ اس جماعت کے سامنے یہی بات پیش کروں۔

میں اور طلبہ قدرتی طور پر اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ کائنات کی پیدائش کے متعلق یہ مواد زمین و آسمان کے بارے میں سائنس کی موجودہ معلومات حاصل ہونے سے ہزاروں سال پہلے لکھا گیا ہے، ہمیں یہ بھی احساس تھا کہ موسیٰ کے زمانے میں کائنات کے متعلق لوگوں کے جو خیالات تھے، اس کو موجودہ زمانے کی معلومات کی روشنی میں دیکھا جائے تو وہ نہایت لغو معلوم ہوں گے۔

ہم نے پورا موسم سرما کتاب پیدائش کے پہلے باب میں گزار دیا، طلبہ کام لے کر یونیورسٹی کی لائبریری میں چلے جاتے اور بڑی محنت کے ساتھ جوابات تیار کر کے لاتے، موسم سرما کے خاتمہ پر پادری نے مجھے بتایا کہ طلبا کی پوری جماعت اس کے پاس یہ کہنے کے لئے آئی تھی کہ وہ عیسائی بننا چاہتے ہیں، انھوں نے اقرار کیا کہ ان کے اوپر یہ ثابت ہو گیا ہے کہ بائبل خدا کی الہامی کتاب ہے"

The Evidence of God, p. 137-38

مثال کے طور پر زمین کی ابتدا کے بارے میں کتاب پیدائش کا فقرہ ہے :۔

"گہرائیوں پر اندھیرا چھایا ہوا تھا"

یہ موجودہ معلومات کے مطابق اس وقت کی بہترین تصویر ہے، جب زمین ابھی گرم تھی، اور اس کی گرمی کی وجہ سے پانی بخارات بن کر اڑ گیا تھا، اس وقت ہمارے تمام سمندر کثیف بادلوں کی شکل میں فضا میں معلق تھے، اور اس کی وجہ سے روشنی زمین کی سطح تک نہیں پہونچ پاتی تھی۔

ہمارا ایمان ہے کہ انجیل اور تورات اصلاً اسی طرح خدا کی کتابیں ہیں، جیسے قرآن خدا کی کتاب ہے، اس لئے ان میں علم الٰہی کے شرارے بلاشبہ موجود ہیں، مگر ان کتابوں کے اصل الفاظ محفوظ نہیں رہے، ہزاروں برس گزرنے کے بعد بائبل اب ہمارے سامنے ایک ایسی کتاب کی شکل میں ہے، جس میں کریسی مارلسین کے الفاظ میں ترجمہ (Translation) اور انسانی الحاق (Human Interpolation) کی وجہ سے اصل خدائی نسخہ کے مقابلے میں بہت فرق پیدا ہو چکا ہے[1]، اس طرح یہ صحیفے پوری شکل میں اصل حیثیت کو کھو چکے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کتابوں کو منسوخ کر کے ہمارے لئے اپنی کتاب کا تصحیح شدہ اڈیشن (قرآن) نازل کیا، قرآن اپنی صحت اور جامعیت کی وجہ سے بدرجہ اتم ان خصوصیات کا حامل ہے جن کی صرف ایک جھلک اب کتب قدیمہ میں باقی رہ گئی ہے۔

یہاں میں قرآن کی اسی خصوصیت کو اس کی صداقت کی تیسری دلیل کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں قرآن باوجودیکہ علمی ترقی سے بہت پہلے نازل ہوا اس کی کوئی بات آج تک غلط ثابت نہ ہو سکی، اگر یہ انسانی کلام ہوتا تو ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔

قرآن ایک ایسے زمانے میں اترا جب انسان عالم فطرت کے بارے میں بہت کم جانتا تھا، اس وقت بارش کے متعلق یہ تصور تھا کہ آسمان میں کوئی دریا ہے، جس سے پانی بہہ کر زمین پر گرتا ہے، اور اسی کا نام بارش

---

[1] *Man Does Not Stand Alone*, p. 120

ہے، زمین کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ وہ چپٹی فرش کی مانند ہے، اور آسمان اس کی چھت ہے جو پہاڑوں کی چوٹیوں کے اوپر کھڑی کی گئی ہے، ستاروں کے متعلق یہ خیال تھا کہ وہ چاندی کی چمکتی ہوئی کیلیں ہیں جو آسمان کے گنبد میں جڑی ہوئی ہیں یا وہ چھوٹے چھوٹے چراغ ہیں جو رات کے وقت رسیوں کی مدد سے لٹکائے جاتے ہیں، قدیم اہل ہند یہ سمجھتے تھے کہ زمین ایک گائے کی سینگ پر ہے، اور جب گائے زمین کو ایک سینگ سے دوسری سینگ پر منتقل کرتی ہے تو اس کے سر کی جنبش سے زلزلہ آجاتا ہے، کوپرنیکس (۱۴۷۳ء-۱۵۴۳ء) تک یہ نظریہ تھا کہ سورج ساکن ہے، اور زمین اس کے گرد گھوم رہی ہے۔

اس کے بعد علم کی ترقی ہوئی، انسان کے مشاہدے اور تجربے کی قوت بڑھ گئی جس کی وجہ سے بے شمار نئی نئی معلومات حاصل ہوئیں، زندگی کا کوئی شعبہ اور علم کا کوئی گوشہ ایسا نہیں رہا جس میں پہلے کے مسلمات بعد کی تحقیق سے غلط ثابت نہ ہو گئے ہوں ـــــ اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈیڑھ ہزار برس پہلے کا کوئی بھی انسانی کلام ایسا نہیں ہو سکتا جو آج بھی اپنی صحت کو پوری طرح باقی رکھے ہوئے ہو ـــــ کیونکہ آدمی اپنے وقت کی معلومات کی روشنی میں بولتا ہے، وہ شعور کے تحت بولے یا لاشعور کے تحت، بہر حال وہ وہی کچھ دہرائے گا، جو اس نے اپنے زمانہ میں پایا ہو، چنانچہ ڈیڑھ ہزار برس پہلے کی کوئی بھی انسانی کتاب آج ایسی موجود نہیں ہے، جو غلطیوں سے پاک ہو ـــــ مگر قرآن کا معاملہ اس سے مختلف ہے، وہ جس طرح ڈیڑھ ہزار برس پہلے کے دور میں برحق تھا آج بھی وہ اسی طرح برحق ہے، زمانے کے گزرنے سے اس کی صداقت میں کوئی فرق نہیں آیا، یہ واقعہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ یہ ایک ایسے ذہن سے نکلا ہوا کلام ہے جس کی نگاہ ازل سے ابد تک محیط ہے ـــــ جو سارے حقائق کو اپنی اصل شکل میں جانتا ہے، جس کی واقفیت زمانے اور حالات کی پابند نہیں اگر یہ محدود نظر رکھنے والے انسان کا کلام ہوتا تو بعد کا زمانہ اسی طرح اس کو غلط ثابت کر دیتا، جیسے ہر انسانی کلام بعد کے زمانے میں غلط ثابت ہو چکا ہے۔

قرآن کا اصل موضوع اُخروی سعادت ہے، اس لحاظ سے وہ دنیا کے معروف علوم و فنون میں سے

کسی کی تعریف میں نہیں آتا، مگر اس کا مخاطب چونکہ انسان ہے، اس لئے قدرتی طور پر وہ اپنی تقریروں میں ہر اس علم کو مس کرتا ہے جس کا تعلق انسان سے ہے، یہ ایک بہت نازک صورت حال ہے کیونکہ آدمی اپنی گفتگو میں اگر کسی فن کو مس کر رہا ہے تو خواہ وہ اس پر کوئی تفصیلی کلام نہ کرے، اگر اس کی معلومات ناقص ہیں، تو یقینی طور پر وہ ایسے الفاظ استعمال کرے گا جو صورت واقعہ سے ٹھیک ٹھیک مطابقت نہ رکھتے ہوں، مثلاً ارسطو نے عورت کی کمتری ثابت کرنے کے لئے یہ کہا کہ ـــــ "اس کے منہ میں مرد سے کم دانت ہوتے ہیں" ظاہر ہے کہ یہ فقرہ علم الاجسام سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، مگر اس کے باوجود وہ ایک ایسا فقرہ ہے جو علم الاجسام سے ناواقفیت کا ثبوت دیتا ہے، کیونکہ یہ معلوم ہے کہ مرد اور عورت کے منہ میں دانت کی تعداد یکساں ہوتی ہے، مگر یہ حیرت انگیز بات ہے کہ قرآن اگرچہ اکثر علوم انسانی کو کہیں نہ کہیں مس کرتا ہے، مگر اس کے بیانات میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں آنے پائی جو بعد کی وسیع تر تحقیقات سے یہ ثابت کرے کہ یہ ایسے شخص کا کلام ہے، جس نے کمتر معلومات کی روشنی میں اپنی باتیں کہی تھیں، صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک بالاتر ہستی کا کلام ہے، جو اس وقت بھی جانتا تھا، جب کوئی نہیں جانتا تھا، اور ان چیزوں کو بھی جانتا تھا جس سے اب تک لوگ ناواقف ہیں۔

یہاں میں مختلف علوم سے متعلق چند مثالیں دوں گا جس سے اندازہ ہوگا کہ ایک علم کو مس کرتے ہوئے بھی قرآن کس طرح حیرت انگیز طور پر ان صداقتوں کا احاطہ کئے ہوئے ہیں، جو قرآن کے نزول کے وقت معلوم شدہ نہیں تھیں، بلکہ بعد کو دریافت ہوئیں۔

اس بحث سے پہلے بطور تمہید یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ جدید تحقیقات سے قرآنی الفاظ کی مطابقت اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ یہ تحقیقات متعلقہ واقعہ کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو چکی ہیں، اور اس طرح مادی کائنات کے بارے میں قرآن کے اشاراتی الفاظ کی تفسیر کے لئے ہم کو ضروری مواد حاصل ہو گیا ہے، اب اگر مستقبل کا مطالعہ کسی موجودہ تحقیق کو کلاً یا جزئاً غلط ثابت کر دے تو اس سے کسی بھی درجہ میں قرآن کی تغلیط نہیں ہوگی، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ قرآن کے مجمل اشارہ کے تفصیلی تعین میں غلطی ہو گئی تھی،

ہم کو یقین ہے کہ آئندہ کی صحیح تر معلومات قرآن کے اشاراتی الفاظ کو زیادہ صحیح طور پر واضح کرنے والی ہوں گی، وہ کسی اعتبار سے اس سے مختلف نہیں ہو سکتیں۔

اس سلسلے میں قرآن کے جو بیانات ہیں، ان کو ہم دو قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں، ایک وہ جو ان امور سے متعلق ہیں، جن کے متعلق انسان کو نزول قرآن کے وقت کسی قسم کی معلومات حاصل نہیں تھیں، اور دوسرے وہ جن کے متعلق وہ سطحی اور ظاہری معلومات رکھتا تھا۔

کائنات کی بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کے متعلق دورِ سابق کے لوگ کچھ نہ کچھ جانتے تھے۔ مگر ان کا یہ علم ان دریافتوں کے مقابلے میں بے حد ناقص اور ادھورا تھا، جو بعد کو علمی ترقی کے دور میں انسان کے سامنے آئیں، قرآن کی مشکل یہ تھی کہ وہ کوئی سائنسی کتاب نہیں تھی، اس لئے اگر وہ عالم فطرت کے بارے میں یکایک نئے نئے انکشافات لوگوں کے سامنے رکھنا شروع کر دیتا تو انھیں چیزوں پر بحث چھڑ جاتی اور اس کا اصل مقصد —— ذہن کی اصلاح —— پس پشت چلا جاتا، یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ اس نے علمی ترقی سے بہت پہلے کے زمانے میں اس طرح کی چیزوں پر کلام کیا، اور ان کے بارے میں ایسے الفاظ استعمال کئے جس میں دورِ سابق کے لوگوں کے لئے توحش کا کوئی سامان نہیں تھا، اور اسی کے ساتھ بعد کے انکشافات کا بھی وہ پوری طرح احاطہ کئے ہوئے تھے۔

الف: قرآن میں دو مقامات پر پانی کا ایک خاص قانون بیان کیا گیا ہے، اول سورۂ فرقان میں، دوسرے سورۂ رحمان میں:۔

اول الذکر اقتباس حسب ذیل ہے۔

وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَّحْجُورًا۔ (الفرقان ۵۳)	اور وہی ہے جس نے ملائے دو دریا ایک کا پانی میٹھا خوش گوار ہے اور ایک کا کھاری تلخ، اور دونوں کے درمیان ایک آڑ رکھ دی۔

دوسری جگہ یہ الفاظ ہیں۔

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ۔ (الرحمٰن ۱۹۔۲۰)

اس نے چلائے دو دریا ملتے ہوئے دونوں کے درمیان ایک آڑ ہے، جس سے وہ تجاوز نہیں کرسکتے

ان آیات میں جس مظہر فطرت کا ذکر ہے، وہ قدیم ترین زمانے سے انسان کو معلوم تھا، وہ یہ کہ دو دریاؤں کے پانی جب باہم مل کر بہتے ہیں تو وہ ایک دوسرے میں شامل نہیں ہوجاتے مثال کے طور پر چاٹگام (مشرقی پاکستان) سے لے کر اراکان (برما) تک دو دریا مل کر بہتے ہیں، اور اس پورے سفر میں دونوں کا پانی بالکل الگ الگ نظر آتا ہے، دونوں کے بیچ میں ایک دھاری سی برابر چلی گئی ہے، ایک طرف کا پانی میٹھا اور دوسری طرف کا کھاری، اسی طرح سمندر کے ساحلی مقامات پر جو دریا بہتے ہیں، ان میں سمندر کے اثر سے برابر مدوجزر (جوار بھاٹا) آتا رہتا ہے، مد کے وقت جب سمندر کا پانی ندی میں آجاتا ہے تو میٹھے پانی کی سطح پر کھاری پانی بہت زور سے چڑھ جاتا ہے، لیکن اس وقت بھی دونوں پانی مختلط نہیں ہوتے اوپر کھاری رہتا ہے، نیچے میٹھا، اس کے بعد جب جزر ہوتا ہے تو اوپر سے کھاری پانی اتر جاتا ہے، اور میٹھا جوں کا توں رہتا ہے، الہ آباد میں گنگا اور جمنا کے سنگم کے مقام پر میں نے خود دیکھا کہ دونوں دریا ملنے کے باوجود الگ الگ بہتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور درمیان میں ایک لکیر مسلسل چلی گئی ہے۔

یہ بات قدیم ترین زمانے سے انسان کے مشاہدے میں آچکی ہے، مگر یہ واقعہ کس قانون فطرت کے تحت واقع ہوتا ہے، یہ ابھی حال میں دریافت کیا گیا ہے، جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ رقیق اشیا میں سطحی تناؤ (Surface Tension) کا ایک خاص قانون ہے، اور یہی دونوں قسم کے پانی کو الگ الگ رکھتا ہے ــــ چونکہ دونوں سیالوں کا تناؤ (Tension) مختلف ہوتا ہے، اس لئے وہ دونوں کو اپنی اپنی حد میں روکے رہتا ہے، آج کل اس قانون کو سمجھ کر جدید دنیا نے بے شمار فوائد حاصل کئے ہیں، قرآن نے بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ کے الفاظ بول کر اس واقعہ کی ایسی تعبیر کی جو قدیم مشاہدے کے

اعتبار سے بھی ٹکرانے والی نہیں تھی، اور اب جدید دریافت پر بھی وہ پوری طرح حاوی ہے، کیونکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ برزخ (آڑ) سے مراد وہ سطح کا تناؤ (Surface Tension) ہے، جو دونوں قسم کے پانی کے درمیان پایا جاتا ہے، اور جو دونوں کو مل جانے سے روکے ہوئے ہے۔

سطحی تناؤ کے قانون کو ایک سادہ سی مثال سے سمجھئے، اگر آپ گلاس میں پانی بھریں تو وہ کنارے تک پہنچ کر فوراً بہنے نہیں لگے گا، بلکہ ایک سوت کے بقدر اٹھ کر گلاس کے کناروں کے اوپر گولائی میں ٹھہر جائے گا، یہی وہ چیز ہے جس کو شاعر نے "خط پیمانہ" کہا ہے۔

اندازۂ ساقی تھا کس درجہ حکیمانہ

ساغر سے اٹھیں موجیں بن کر خط پیمانہ

گلاس کے کناروں کے اوپر پانی کی جو مقدار ہوتی ہے، وہ کیسے ٹھہرتی ہے، بات یہ ہے کہ رقیق اشیا کی سطح کے سالمات Molecules کے بعد چونکہ کوئی چیز نہیں ہوتی اس لئے ان کا رخ اندر کی طرف ہو جاتا ہے، اس طرح کے سالمات کے درمیان کشش اتصال بڑھ جاتی ہے، اور قانون اتصال (Cohesion) کے عمل کی وجہ سے پانی کی سطح کے اوپر ایک قسم کی لچکدار جھلی (Elastic Film) سی بن جاتی ہے، اور پانی گویا اس کے غلاف میں اس طرح ملفوف ہو جاتا ہے، جیسے پلاسٹک کی سفید جھلی میں پسا ہوا نمک ملفوف ہوتا ہے، سطح کا یہی پردہ اوپر ابھرے ہوئے پانی کو روکتا ہے، یہ پردہ اس حد تک قوی ہوتا ہے کہ اگر اس کے اوپر سوئی ڈال دی جائے تو وہ ڈوبے گی نہیں بلکہ پانی کی سطح پر تیرتی رہے گی، اسی کو سطحی تناؤ کہا جاتا ہے، اور یہی وہ سبب ہے جس کی بنا پر تیل اور پانی ایک دوسرے میں حل نہیں ہوتے اور یہی وہ "آڑ" ہے، جس کی وجہ سے کھاری پانی اور میٹھے پانی کے دو دریا مل کر بہتے ہیں مگر ایک کا پانی دوسرے میں شامل نہیں ہوتا۔

ب: ارشاد ہوا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ	اللہ وہ ہے جس نے آسمان کو بلند کیا، بغیر ایسے

عَمَدٍ تَرَوْنَهَا۔ (رعد - ۲) ستونوں کے جنھیں تم دیکھ سکو۔

دورِ قدیم کے انسان کے لئے یہ الفاظ اس کے ظاہری مشاہدے کے عین مطابق تھے، کیونکہ وہ دیکھتا تھا کہ اس کے سر کے اوپر سورج، چاند اور ستاروں کی ایک دنیا کھڑی ہے، مگر کہیں اس کا پایہ اور کھمبا نظر نہیں آتا اور اب جدید ترین معلومات رکھنے والے انسان کے لئے بھی اس میں مکمل معنویت موجود ہے، کیونکہ جدید ترین مشاہدہ بتاتا ہے کہ اجرام سماوی ایک لامحدود خلا میں بغیر کسی سہارے کے قائم ہیں، اور ایک "عمد غیر مرئی" یعنی کشش ثقل (Gravitational Pull) ان کو بالائی فضا میں سنبھالے ہوئے ہے۔

ج: اسی طرح سورج اور تمام ستاروں کے بارے میں کہا گیا ہے :-

كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ۔ (الانبیاء-۳۳) سب کے سب ایک آسمان میں تیر رہے ہیں۔

دور قدیم میں بھی انسان اجرام سماوی کو حرکت کرتا ہوا دیکھتا تھا، اس لئے ان الفاظ سے اس کو توحش نہیں ہوا، مگر جدید معلومات نے ان الفاظ کو اور زیادہ بامعنی بنا دیا ہے، بسیط اور لطیف خلا میں اجرام سماوی کی گردش کے لئے "تیرنے" سے بہتر کوئی تعبیر نہیں ہو سکتی۔

د: رات اور دن کے متعلق قرآن میں ہے :-

يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا۔ اللہ اوڑھاتا ہے رات پر دن کو وہ اس کے پیچھے لگا آتا ہے دوڑتا ہوا۔ (الاعراف-۵۴)

یہ الفاظ قدیم انسان کے لئے صرف رات دن کی ظاہری آمد و شد کو بتاتے تھے، مگر اس میں نہایت عمدہ اشارہ زمین کی محوری گردش کی طرف بھی موجود ہے، جو جدید مشاہدے کے مطابق رات اور دن کی تبدیلی کی اصل وجہ ہے، یہاں میں یاد دلاؤں گا کہ روس کے پہلے خلائی مسافر نے خلا سے واپسی کے بعد اپنے جو شاہدات بیان کئے تھے، اس میں ایک یہ بھی تھا کہ زمین کو اس نے اس شکل میں دیکھا کہ سورج کے سامنے محوری گردش کی وجہ سے اس کے اوپر اندھیرے اور اجالے کی آمد و رفت کا ایک تیز تسلسل Rapid Succession جاری تھا۔

اس طرح کے بیانات قرآن میں کثرت سے موجود ہیں۔

دوسری مثالیں وہ ہیں، جن کے متعلق پچھلے زمانے کے لوگ قطعاً کوئی معلومات نہیں رکھتے تھے، قرآن نے ان کا ذکر کیا، اور ایسی باتیں کہیں جو حیرت انگیز طور پر جدید انکشافات سے صحیح ثابت ہوتی ہیں، یہاں میں مختلف علمی شعبوں سے اس کی چند مثالیں پیش کروں گا۔

فلکیات

قرآن نے مادی کائنات کے آغاز و انجام کا ایک خاص تصور دیا ہے، یہ تصور سو برس پہلے تک انسان کے لئے بالکل نامعلوم تھا اور نزول قرآن کے زمانے میں تو اس کا تصور بھی کسی کے ذہن میں نہیں گزر سکتا تھا، مگر جدید مطالعہ نے حیرت انگیز طور پر اس کی تصدیق کی ہے، آغاز کائنات کے بارے میں قرآن کا بیان یہ ہے۔

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ	کیا منکرین نہیں دیکھتے کہ زمین و آسمان ملے
وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا۔ (انبیاء: ۳۰)	ہوئے تھے، پھر ہم نے ان کو پھاڑ دیا۔

اور اس کا انجام یہ بتایا گیا ہے۔

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ	اس دن لپیٹ دیں گے ہم آسمان کو جیسے لپیٹتے
(الانبیاء - ۱۰۴)	ہیں طومار میں کاغذ۔

ان الفاظ کے مطابق کائنات ابتداءً ایک سمٹی ہوئی حالت میں تھی اور اس کے بعد پھیلنا شروع ہوئی، اس پھیلاؤ کے باوجود اس کا اصل مادہ اتنا کم ہے کہ تھوڑی سی جگہ میں اس کو دوبارہ سمیٹا جا سکتا ہے۔

کائنات کے بارے میں جدید ترین تصور یہی ہے، مختلف قرائن اور مشاہدات کی بنیاد پر سائنسدان

---

۱ رتق ـــــ منضم الاجزاء

اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ ابتدا میں کائنات کا مادہ جمود اور سکون کی حالت میں تھا، یہ ایک بہت ہی سخت سکڑی ہوئی اور گھٹی ہوئی انتہائی گرم گیس تھی، تقریباً پچاس کھرب سال پہلے ایک زبردست دھماکے سے وہ پھٹ پڑی اور اس کے ساتھ ہی اس کے ٹوٹے ہوئے اجزا چاروں طرف پھیلنے لگے، جب ایک بار پھیلاؤ شروع ہو گیا تو اس کا جاری رہنا لازمی تھا، کیونکہ اجزائے مادہ جیسے جیسے دور ہوں گے، ان کا باہمی کشش کا اثر ایک دوسرے پر کم ہوتا جائے گا، آغاز میں کائنات کا جو مادہ تھا، اس کے مکانی دائرہ کا اندازہ تقریباً ایک ہزار ملین سال نور ہے اور اب پروفیسر ایڈنگٹن کے اندازے کے مطابق وہ سابقہ دائرہ کے مقابلے میں تقریباً دس گنا بڑھ چکا ہے، یہ عمل توسیع اب بھی جاری ہے، ایڈنگٹن کے الفاظ میں :-

"ستاروں اور کہکشاؤں کی مثال ایک ایسے ربر کے غبارے کی سطح کے نشانات کی سی ہے جو مسلسل پھیل رہا ہو، اسی طرح اپنی ذاتی حرکت کے ساتھ تمام آسمانی کرے کائناتی پھیلاؤ کے ساتھ ہر آن دور ہوتے جا رہے ہیں۔"

The Limitations of Science, p. 20

دوسری بات بھی جدید ترین مطالعہ سے کائنات کے ڈھانچے کے عین مطابق ثابت ہوئی ہے، قدیم انسان یہ سمجھتا تھا کہ ستارے اتنے ہی فاصلوں پر ہیں جیسے کہ وہ بظاہر نظر آتے ہیں، مگر اب معلوم ہوا کہ وہ دوری کی وجہ سے قریب قریب نظر آتے ہیں، ورنہ وہ ایک دوسرے سے بے انتہا بعید فاصلے پر واقع ہیں، اور یہی نہیں بلکہ وہ اجسام جو بظاہر سالم نظر آتے ہیں، ان کا بھی ایک بڑا حصہ درحقیقت خلا ہے، جس طرح شمسی نظام میں بہت سے سیارے اور سیارچے ایک دوسرے سے دور دور فاصلوں پر رہتے ہوئے ایک نظام کے تحت گردش کرتے ہیں، اسی طرح ہر مادی جسم چھوٹے پیمانے کے بے شمار شمسی نظاموں کا مجموعہ ہے جن کو "ایٹم" کہتے ہیں[1]، نظام شمسی کا خلا ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں، مگر ایٹمی نظام کا خلا، انتہائی چھوٹا ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آتا، گویا ہر چیز، خواہ وہ بظاہر ٹھوس نظر آ رہی ہو، اندر سے

[1] ایٹم کی ساخت کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ص ۲۶

کھو کھلی ہے، مثلاً چھ فٹ لمبے چوڑے انسانی جسم کے مادی ذرات کے درمیان سے اگر خلا یا مکان (space) کو نکال دیا جائے تو باقی ماندہ مادہ کی بساط بس ایک غیر مرئی دھبہ کی سی رہ جائے گی۔

اسی طرح فلکی طبیعیات کے ماہرین (Astrophysicists) نے کائنات میں پھیلے ہوئے پورے مادہ کا حساب لگایا ہے، ان کا کہنا ہے۔

"If all this were squeezed without leaving any space, the size of the universe will be only thirty times the size of the sun."

یعنی اگر ساری کائنات کو اس طرح سمیٹ دیا جائے کہ اس میں خلا باقی نہ رہے تو ساری کائنات کا حجم موجودہ سورج سے صرف ۳۰ گنا زیادہ ہوگا، جبکہ کائنات کی وسعت کا یہ حال ہے کہ شمسی نظام سے بعید ترین کہکشاں جو اب تک دیکھی جا سکی ہے، وہ سورج سے کئی ملین سال نور کے فاصلے پر واقع ہے۔

۲۔ دور جدید کے ماہرین فلکیات اپنے مشاہدے اور ریاضیاتی اندازے کی بنا پر اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ اجرام سماوی جس قانون کے تحت گردش کر رہے ہیں اس کے مطابق مستقبل بعید میں ایک وقت آنے والا ہے، جب چاند زمین کے بہت قریب آجائے گا، اور دو طرفہ کشش کی تاب نہ لاکر پھٹ جائے گا اور اس کے ٹکڑے زمین کے گرد فضا میں پھیل جائیں گے۔

Man does not Stand Alone, p. 24

"شق قمر" کا یہ واقعہ اسی قانون کشش کے تحت ہوگا، جس کا مظاہرہ جوار بھاٹے کی شکل میں سمندروں میں ہوتا رہتا ہے، چاند بالائی فضا میں ہمارا قریب ترین ہمسایہ ہے، یعنی زمین سے اس کا فاصلہ صرف دو لاکھ چالیس ہزار میل ہے، اس قربت کی وجہ سے اس کی کشش کا اثر سمندروں پر پڑتا ہے، اور دن میں دو بار پانی اوپر اٹھ کر غیر معمولی تموج پیدا کرتا ہے، یہ موجیں بعض مقامات پر ساٹھ فٹ کے قریب اوپر تک اٹھ جاتی ہیں، اور خشکی کی سطح بھی اس قمری کشش سے چند انچ تک متاثر ہوتی ہے، چاند اور زمین کا

موجودہ فاصلہ بہت مناسب مقدار پر ہے اور اس کے بہت سے فوائد ہیں، اس کے بجائے اگر یہ فاصلہ گھٹ جائے مثلاً پچاس ہزار میل پر آجائے تو سمندروں میں اس شدت سے طوفان برپا ہو کہ خشکی کا بیشتر حصہ اس میں غرق ہو جائے اور طوفانی موجوں کے مسلسل ٹکراؤ سے پہاڑ کٹ کر ریزے ریزے ہو جائیں، اور زمین اس کی کشش سے پھٹنے لگے۔

ماہرین فلکیات کا اندازہ ہے کہ زمین کی ابتدائی پیدائش کے وقت چاند اسی طرح زمین کے قریب تھا، اور اس وقت زمین کی سطح پر یہ سب کچھ ہو چکا ہے، اس کے بعد فلکیاتی قانون نے اسے موجودہ دوری پر پہنچا دیا، ان کا خیال ہے کہ ایک بلین سال تک یہ صورت باقی رہے گی، اور اس کے بعد یہی فلکی قانون دوبارہ چاند کو زمین کے قریب لائے گا، اور اس وقت چاند اور زمین کی باہمی کشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ چاند پھٹ جائے گا اور ٹکڑے ہو کر زمین کے گرد ایک حلقہ کی شکل میں پھیل جائے گا۔

یہ نظریہ حیرت انگیز طور پر اس پیشین گوئی کی تصدیق ہے، جو سورۂ قمر میں وارد ہے، یعنی قیامت جب قریب آئے گی تو چاند پھٹ جائے گا اور اس کا پھٹنا قرب قیامت کی علامتوں میں سے ایک علامت ہوگا۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝	قیامت نزدیک آگئی اور چاند پھٹ گیا اور یہ لوگ
وَاِنْ یَّرَوْا اٰیَةً یُّعْرِضُوْا وَیَقُوْلُوْا	کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں،
سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝ (القمر ۱-۲)	اور کہتے ہیں کہ یہ جادو ہے جو سدا سے چلا آرہا ہے[1]۔

---

[1] شق قمر کا واقعہ صحیحین میں اور دوسری کتب حدیث میں مستند روایات سے بیان کیا گیا ہے، ان راویوں میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی ہیں جو بذات خود اس واقعہ کے عینی شاہد ہیں، اس کے باوجود شق قمر کا مسئلہ قدیم مفسرین و متکلمین سے لے کر اب تک شدید بحث کا موضوع رہا ہے، اکثریت کی رائے یہ ہے کہ شق قمر کا واقعہ ہو چکا ہے اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ قیامت کے قریب ہوگا (قال بعض المفسرین سینشق تفسیر کبیر) اس دوسرے گروہ میں امام حسن بصری بھی شامل ہیں جن کا قول ابوحیان اندلسی نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

ان المعنی اذا جاءت الساعة انشق القمر — "اقتربت الساعة وانشق القمر" کا مطلب یہ ہے کہ
(باقی ص ۱۶۹)

ارضیات

پہاڑوں کے بارے میں قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کہا گیا ہے کہ وہ زمین کا توازن برقرار رکھنے کے لئے ہیں، مثلاً فرمایا:۔

وَ اَلْقٰى فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ — اور زمین میں پہاڑ بنا دیئے تاکہ زمین تم کو لے کر جھک نہ پڑے۔ (لقمان ۔ ۱۰)

ان الفاظ کے نزول کے پورے تیرہ سو برس تک انسانی علم پہاڑوں کی اس حیثیت کے بارے میں بالکل بے خبر تھا، مگر اب جغرافیہ اس سے آشنا ہو چکا ہے اور جدید جغرافی اصطلاح میں اس کو توازن (Isostasy) کہا جاتا ہے اگرچہ اس سلسلے میں انسان کا علم ابھی ابتدائی منزل میں ہے، تاہم انگلن کے الفاظ میں "یہ سمجھا جاتا ہے کہ زمین کی سطح پر جو ہلکا مادہ تھا، وہ پہاڑوں کی شکل میں ابھر آیا اور جو بھاری مادہ تھا، وہ گہری خندقوں کی صورت میں دب گیا جن میں اب سمندر کا پانی بھرا ہوا ہے، اس طرح ابھار اور دباؤ نے مل کر زمین کا توازن برقرار کر رکھا ہے"[1]

(باقی صـ ۱۷۵ کا)

جب قیامت قریب آئے گی تو چاند پھٹ جائے گا بعد النفخة الثانية۔

اور یہ واقعہ دوسری بار صور پھونکے جانے کے بعد ہو گا (البحر المحیط، جلد ثامن صفحہ ۱۷۳)

ان دونوں خیالات میں تطبیق کی صورت بعض لوگوں نے یہ نکالی ہے کہ انھوں نے ان دونوں کو تسلیم کر لیا ہے، ان کے خیال کے مطابق احادیث میں مکہ کے ایک مجمع کے سامنے جس شق قمر کا ذکر ہے، وہ بھی ایک واقعہ ہے خواہ وہ امام غزالی اور شاہ ولی اللہ کے خیال کے مطابق بصری تصرف کے تحت ہوا ہو، یا فی الواقع کوئی فلکیاتی انشقاق ہو، اور قیامت کے قریب شق قمر کی بات بھی صحیح ہے پہلا واقعہ گویا ایک ابتدائی علامت ہے اس واقعہ کی جو قرب قیامت میں آخری شکل میں ظاہر ہو گا۔ علامہ شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں،

"شق القمر کا معجزہ ایک نمونہ اور نشانی تھی، قیامت کی کہ آگے سب کچھ یوں ہی پھٹے گا"

[1] O.R. Van Engeln, *Geomorphology*, New York 1948 p. 26-27

ایک اور مصنف لکھتا ہے۔

"جیسے خشکی پر وادیاں ہیں، اسی طرح سمندر کے نیچے بھی وادیاں ہیں، مگر سمندر کی تہہ کی اکثر وادیاں زیادہ گہری اور انسان کے تجرباتی دائرہ کے لحاظ سے بہت دور ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی غیر معمولی دباؤ سے سمندروں میں گہرے غار ہو گئے ہیں (یہ وادیاں سطح سمندر سے ۳۵ ہزار فٹ تک گہری ہیں، یہ گہرائی کسی بھی پہاڑ کی بلندی سے زیادہ ہے، بعض مقامات پر یہ گھاٹیاں اتنی گہری ہیں کہ اگر زمینی پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی ماؤنٹ ایوریسٹ کو جو ۲۹۰۰۲ فٹ بلند ہے، وہاں ڈال دیا جائے تو اس کے اوپر ایک میل کی اونچائی تک پانی بہتا رہے گا) حیرت یہ ہے کہ یہ سمندری خندقیں (Oceanic Trenches) دور سمندر کے درمیان واقع ہونے کے بجائے خشکی کے قریب قریب پائی جاتی ہیں، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون سا عظیم دباؤ تھا جس نے سمندر کی تہہ میں یہ زبردست غار پیدا کر دیئے، مگر جزائری سلسلوں اور آتش فشاں پہاڑوں سے ان کی قربت ظاہر کرتی ہے کہ پہاڑی بلندیوں اور سمندری خندقوں میں کوئی باہمی تعلق ہونا چاہئے، گویا کہ زمین اونچائی اور گہرائی کے ذریعہ اپنے توازن (Balance) کو قائم رکھتی ہے، جغرافیہ کے بعض مستند علما کا خیال ہے کہ سمندری گہرائیاں آئندہ ابھرنے والی خشکی کی علامتیں ہو سکتی ہیں، کیونکہ پانی کے نیچے ان اندھیرے غاروں میں صدیوں سے بہہ بہہ کر خشکی اور سمندر کی تہہ کی گاد (Sediment) تہہ بہ تہہ جمع ہو رہی ہے، اور میلوں پاٹتی چلی جا رہی ہے، اس لئے کسی وقت عدم توازن کی بنا پر ہو سکتا ہے کہ سمندر کے نیچے کی اتھاہ گہرائیوں میں جمع ہونے والے مادے کا دباؤ پڑنے سے نئے پہاڑ ابھر آئیں یا نئے جزائری سلسلے پیدا ہو جائیں، ساحل کے بعض پہاڑوں میں اس طرح کی سمندری گاد کے نشانات پائے گئے ہیں، مگر انسان کی موجودہ معلومات کے دائرے میں کوئی بھی نظریہ سمندری خندقوں کی مکمل توجیہہ نہیں کرتا، یہ دائمی سرد اور دائمی تاریک غار جو فی مربع انچ سات ٹن بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں، وہ ابھی انسان

کے لئے سمندر کے دوسرے عموں میں سے ایک معما ہیں۔"

The *World We Live In*, New York 1965

۲۔ اسی طرح قرآن میں یہ کہا گیا ہے کہ زمین پر ایک وقت ایسا گزرا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو پھاڑ کر پھیلا دیا۔

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ۝ اَخْرَجَ — اس کے بعد خدا نے زمین کو پھیلایا اور اس میں سے

مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا۔ (النازعات ۳۱) — اس کا پانی اور چارہ نکالا۔

یہ الفاظ جدید ترین نظریۂ انتشار براعظم (Theory of Drifting Continents) کے عین مطابق ہیں، اس نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے تمام براعظم کسی زمانے میں ایک ہی بڑی زمین کے حصے تھے، اس کے بعد وہ پھٹ کر سطح زمین پر اِدھر اُدھر پھیل گئے اور بھرے ہوئے سمندروں کے ارد گرد براعظموں کی ایک دنیا آباد ہوگئی۔

اس نظریے کو پہلی بار باقاعدہ طور پر ۱۹۱۵ء میں ایک جرمن ماہر ارضیات الفرڈ ویجنر (Alfred Wegener) نے پیش کیا، اس کی دلیل یہ تھی کہ براعظموں کو اگر قریب کیا جائے تو وہ سب کے سب (Jigsaw Puzzle) کی طرح آپس میں جڑ جاتے ہیں (مثلاً جنوبی امریکہ کا مشرقی ساحل افریقہ کے مغربی ساحل سے مل رہا ہے)



اس قسم کی اور بہت سی مشابہتیں ہیں جو وسیع سمندروں کے دونوں طرف پائی گئی ہیں، مثلاً ایک قسم کے پہاڑ یکساں ارضیاتی سال کی چٹانیں، ایک قسم کے جانور اور مچھلیاں اور ایک طرح کے پودے، چنانچہ علم نباتات کا ماہر پروفیسر رونالڈ گڈ Ronald Good اپنی کتاب موسومہ Geography of the Flowering Plants میں لکھتا ہے :۔

"نباتات کے ماہرین کا تقریباً متفقہ نظریہ ہے کہ مختلف پودے جو زمین کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں، ان کی توجیہہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ ہم یہ فرض کریں کہ زمین کے ٹکڑے ماضی میں کبھی باہم ملے ہوئے تھے"

اور اب تو حجری کشش (Fossil Magnetism) سے تصدیق حاصل ہونے کے بعد اس کو قطعی سائنسی نظریہ کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے، پتھر کے ذرات کے رخ کا مطالعہ کر کے یہ معلوم کر لیا جاتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں اس کی چٹان کا عرض البلد اور طول البلد کیا تھا، اس مطالعہ سے معلوم ہوا ہے کہ زمین کے موجودہ ٹکڑے ماضی میں ان مقامات پر نہیں تھے، جہاں وہ آج نظر آتے ہیں، بلکہ ٹھیک ان مقامات پر تھے، جہاں براعظموں کے انتشار کا نظریہ تقاضا کرتا ہے، امپیریل کالج (لندن) میں فزکس کے استاد پروفیسر پی۔ ایم۔ ایس بلیکٹ (Blacket) نے کہا ہے :۔

"ہندوستانی پتھر کی پیمائش یقینی طور پر بتاتی ہے کہ ستر ملین سال پہلے ہندوستان خط استوا کے جنوب میں واقع تھا جنوبی افریقہ کی چٹانوں کا مشاہدہ ثابت کرتا ہے کہ افریقی براعظم تین سو ملین سال پہلے قطب جنوبی سے ٹوٹ کر نکلا ہے" (تفصیل کے لئے۔ ریڈرز ڈائجسٹ، جون ۱۹۶۱ء)

اوپر ہم نے جو آیت نقل کی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے "دحو" کا لفظ استعمال کیا ہے، دحو کے معنی کسی مجتمع چیز کو پھیلانے اور بکھیر دینے کے ہیں، عربی میں کہا جاتا ہے "دحا المطر الحصی عن وجہ الارض" (بارش زمین پر سے کنکریوں کو بہالے گئی) تقریباً یہی مفہوم انگریزی لفظ (Drift) کا بھی ہے، جو اس جغرافی نظریے کی تعبیر کے لئے موجودہ زمانے میں اختیار کیا گیا ہے، قدیم ترین ماضی اور حال میں اس حیرت انگیز یکسانیت

کی توجیہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ ایسی ہستی کا کلام ہے جس کا علم ماضی اور حال سب پر محیط ہے۔

غذائیات

کتاب الٰہی میں انسان کے لئے جو مینو بتایا گیا ہے، اس کے مطابق خون ہمارے لئے حرام ہے، نزول کتاب کے وقت تک انسان اس قانون کی غذائی اہمیت سے بے خبر تھا، لیکن بعد کو جب سائنسی طور پر خون کے اجزا کی تحلیل کی گئی تو معلوم ہوا کہ یہ قانون نہایت اہم مصلحت پر مبنی تھا، سائنسی تجزیہ نے اس کو رد نہیں کیا بلکہ اس کی معنویت ہم پر واضح کی۔

یہ تجزیہ بتاتا ہے کہ خون میں کثرت سے یورک ایسڈ (Uric Acid) موجود ہے، جو ایک تیزابی مادہ ہونے کی وجہ سے خطرناک زہریلی تاثیر اپنے اندر رکھتا ہے، اور غذا کے طور پر اس کا استعمال سخت مضر ہے، ذبیحہ کا مخصوص طریقہ جو اسلام میں بتایا گیا ہے، اس کی مصلحت بھی یہی ہے، اسلامی اصطلاح میں ذبیحہ سے مراد جانور کو خدا کے نام پر ایسے طریقہ سے ذبح کرنا ہے، جس سے اس کے جسم کا سارا خون نکل جائے، اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ جانور کی صرف شہ رگ کو کاٹا جائے لیکن گردن کی رگوں کو قائم رکھا جائے تاکہ مذبوحہ کے دل اور دماغ کے درمیان موت تک تعلق قائم رہے، اور جانور کی موت کا باعث صرف کامل اخراج خون ہو نہ کہ کسی اعضائے رئیسہ پر صدمہ کا پہنچنا، کیونکہ کسی اعضائے رئیسہ مثلاً دماغ، دل یا جگر کے صدمہ رسیدہ ہونے سے فی الفور موت تو وارد ہو جاتی ہے، لیکن ایسی صورت میں خون آناً فاناً جسم میں منجمد ہو کر تمام گوشت میں سرایت کر جاتا ہے، اور سارا گوشت یورک ایسڈ کی آمیزش کی وجہ سے زہریلا ہو جاتا ہے۔

اسی طرح سور کو بھی حرام کیا گیا ہے، زمانۂ قدیم میں انسان کو اس کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہ تھا، مگر جدید طبی تحقیقات نے بتایا ہے کہ اس کے اندر بہت سے نقصانات ہیں، مثلاً مذکورہ بالا یورک ایسڈ جو ایک زہریلا مادہ ہے اور ہر جاندار کے خون میں موجود رہتا ہے، وہ اور جانداروں کے جسم سے تو خارج ہو جاتا ہے،

مگر سور کے اندر سے خارج نہیں ہوتا، گردے جو ہر انسانی جسم میں ہوتے ہیں، وہ اس زہریلے مادے کو پیشاب کے ذریعہ خارج کرتے رہتے ہیں، انسانی جسم اس مادے کو نوے فیصدی خارج کر دیتے ہیں، مگر سور کے جسم کے عضلات کی ساخت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ اس کے خون کا یورک ایسڈ صرف دو فیصدی ہی خارج ہو پاتا ہے اور بقیہ حصہ اس کے جسم کا جز و بنتا رہتا ہے، چنانچہ سور خود بھی جوڑوں کے درد میں مبتلا رہتا ہے، اور اس کا گوشت کھانے والے بھی وجع المفاصل جیسی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔[1]

اس طرح کی مثالیں کثرت سے قرآن و حدیث میں موجود ہیں اور یہ مثالیں اس بات کا قطعی ثبوت ہیں کہ یہ غیر انسانی ذہن سے نکلا ہوا ہے۔ بعد کی معلومات نے حیرت انگیز طور پر اس پیشین گوئی کی تصدیق کی ہے، جس کو ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔

"عنقریب ہم آفاق و انفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے گا کہ یہ حق ہے" (القرآن)

یہاں میں ایک واقعہ نقل کروں گا جس کے راوی علامہ عنایت اللہ مشرقی ہیں، اور اس کا تعلق انگلستان سے ہے:

"۱۹۰۹ء کا ذکر ہے، اتوار کا دن تھا، اور زور کی بارش ہو رہی تھی، میں کسی کام سے باہر نکلا تو جامعہ کیمبرج کے مشہور ماہر فلکیات سر جیمز جینس (James Jeans) پر نظر پڑی جو بغل میں انجیل دبائے چرچ کی طرف جا رہے تھے، میں نے قریب ہو کر سلام کیا، انھوں نے کوئی جواب نہ دیا، دوبارہ سلام کیا تو

---

[1] یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ کوئی غذا، خواہ وہ مفید ہو یا مضر، جب اس کی تاثیرات بتائی جاتی ہیں تو یہ صرف اس کی انفرادی تاثیر کا بیان ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب وہ کھائی جائے تو لازمی طور پر فوراً ہر شخص میں وہی اثر بھی ظاہر کرے جو انفرادی مطالعہ میں ہم نے اس کے اندر پایا تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی عموماً کسی چیز کو تنہا شکل میں اس طرح نہیں کھاتا کہ صرف اسی کو اکیلے عمل کرنے کا موقع ملے بلکہ مختلف چیزوں کے ساتھ ایک چیز کو پیٹ میں داخل کرتا ہے، اسی طرح اور بھی اسباب ہیں جن کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ مختلف چیزوں کے عمل اور رد عمل سے اکثر ایک چیز کی انفرادی تاثیر گھٹ جاتی ہے اور بعض اوقات ختم بھی ہو جاتی ہے، تاہم جب کسی چیز کی ذاتی خصوصیات کا تجزیہ کیا جائے تو وہی بات کہی جائے گی جو انفرادی طور پر اس کے اندر ثابت ہو رہی ہو

وہ متوجہ ہوئے اور کہنے لگے "تم کیا چاہتے ہو" میں نے کہا، دو باتیں اول یہ کہ زور سے بارش ہو رہی ہے اور آپ نے چھاتا بغل میں داب رکھا ہے، سر جیمز اپنی بدحواسی پر مسکرائے اور چھاتا تان لیا، دوم یہ کہ آپ جیسا شہرۂ آفاق آدمی گرجا میں عبادت کے لئے جا رہا ہے، یہ کیا؟ میرے اس سوال پر پروفیسر جیمز لمحہ بھر کے لئے رک گئے اور پھر میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا "آج شام کو چائے میرے ساتھ پیو" چنانچہ میں شام کو ان کی رہائش گاہ پہنچا، ٹھیک ۴ بجے لیڈی جیمز باہر آ کر کہنے لگیں "سر جیمز تمہارے منتظر ہیں" اندر گیا تو ایک چھوٹی سی میز پر چائے لگی ہوئی تھی، پروفیسر صاحب تصورات میں کھوئے ہوئے تھے، کہنے لگے "تمہارا سوال کیا تھا" اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر اجرام آسمانی کی تخلیق، ان کے حیرت انگیز نظام بے انتہا پہنائیوں اور فاصلوں، ان کی پیچیدہ راہوں اور مداروں نیز باہمی کشش اور طوفان ہائے نور پر وہ ایمان افروز تفصیلات پیش کیں کہ میرا دل اللہ کی اس داستانِ کبریا و جبروت پر دہلنے لگا، اور ان کی اپنی کیفیت یہ تھی کہ سر کے بال سیدھے اٹھے ہوئے تھے، آنکھوں سے حیرت و خشیت کی دو گونہ کیفیتیں عیاں تھیں، اللہ کی حکمت و دانش کی ہیبت سے ان کے ہاتھ قدرے کانپ رہے تھے، اور آواز لرز رہی تھی، فرمانے لگے "عنایت اللہ خاں! جب میں خدا کے تخلیقی کارناموں پر نظر ڈالتا ہوں تو میری تمام ہستی اللہ کے جلال سے لرزنے لگتی ہے، اور جب کلیسا میں خدا کے سامنے سرنگوں ہو کر کہتا ہوں "تو بہت بڑا ہے" تو میری ہستی کا ہر ذرہ میرا ہمنوا بن جاتا ہے، مجھے بےحد سکون اور خوشی نصیب ہوتی ہے، مجھے دوسروں کی نسبت عبادت میں ہزار گنا زیادہ کیف ملتا ہے، کہو عنایت اللہ خاں! تمہاری سمجھ میں آیا کہ میں گرجے کیوں جاتا ہوں"۔

علامہ مشرقی کہتے ہیں کہ پروفیسر جیمز کی اس تقریر نے میرے دماغ میں عجیب کہرام پیدا کر دیا، میں نے کہا "جناب والا! میں آپ کی روح افروز تفصیلات سے بےحد متاثر ہوا ہوں، اس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یاد آگئی اگر اجازت ہو تو پیش کروں، فرمایا "ضرور" چنانچہ میں نے یہ آیت پڑھی :-

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ پہاڑوں میں خطے ہیں سفید اور سرخ اور طرح طرح

اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ۝ وَمِنَ النَّاسِ	کے رنگ کے اور کالے، اور آدمیوں میں اور کیڑوں
وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ	میں اور چوپاؤں میں، اسی طرح مختلف رنگ
كَذٰلِكَ ۗ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ	ہیں، اللہ سے ڈرتے وہی ہیں اس کے بندوں میں
الْعُلَمٰٓؤُا ۗ (فاطر ۲۷، ۲۸)	سے جو علم رکھتے ہیں۔

یہ آیت سنتے ہی پروفیسر جیمز بولے :۔

"کیا کہا ____ اللہ سے صرف اہل علم ڈرتے ہیں، حیرت انگیز، بہت عجیب، یہ بات جو مجھے پچاس برس مسلسل مطالعہ و مشاہدہ کے بعد معلوم ہوئی، محمدؐ کو کس نے بتائی، کیا قرآن میں واقعی یہ آیت موجود ہے، اگر ہے تو میری شہادت لکھ لو کہ قرآن ایک الہامی کتاب ہے، محمدؐ ان پڑھ تھا، اسے یہ عظیم حقیقت خود بخود معلوم نہیں ہو سکتی، اسے یقیناً اللہ نے بتائی تھی، بہت خوب، بہت عجیب....."

(نقوش، شخصیات نمبر، صفحات ۱۲۰۸-۹)

مذہب اور تمدّنی مسائل

تمدنی مسائل کے سلسلے میں بنیادی سوال یہ ہے کہ اس کا قانون کیا ہو، تمدنی مسائل انسانوں کے باہمی روابط سے پیدا ہوتے ہیں اور ان روابط کو جو چیز منصفانہ طور پر متعین کرتی ہے، وہ قانون ہے مگر یہ حیرت انگیز بات ہے کہ آج تک انسان اپنی زندگی کا قانون دریافت نہ کر سکا، کہنے کو اگرچہ ساری دنیا میں قانونی حکومتیں قائم ہیں، مگر یہ تمام "قوانین" نہ صرف یہ کہ اپنے مقصد میں بری طرح ناکام ہیں بلکہ جبری نفاذ کے سوا ان کی پشت پر کوئی حقیقی وجہ جواز بھی موجود نہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ رائج الوقت قوانین اپنے حق میں علمی اور نظریاتی بنیاد سے محروم ہیں — فلر (L.L. Fuller) کے الفاظ میں قانون نے ابھی اپنے آپ کو نہیں پایا ہے اس نے ایک کتاب لکھی ہے، جس کا نام ہے "قانون خود اپنی تلاش میں"

The Law in Quest of Itself

دورِ جدید میں ان مسائل پر بے شمار لٹریچر تیار ہوا ہے، بڑے بڑے دماغ اپنی اعلیٰ صلاحیتیں اور اپنے بہترین اوقات اس کے لئے صرف کر رہے ہیں، اور چیمبرز انسائیکلوپیڈیا کے مقالہ نگار کے الفاظ میں "قانون کو ایک زبردست فن کی حیثیت دے کر اس کو عظیم ترقی تک پہونچا دیا ہے" مگر اب تک کی ساری کوششیں قانون کا کوئی متفقہ تصور حاصل کرنے میں ناکام رہی ہیں، حتیٰ کہ ایک عالم قانون کے الفاظ میں "اگر دس قانون دانوں کو قانون کی تعریف بیان کرنے کے لئے کہا جائے تو بلا مبالغہ ہم کو گیارہ مختلف قسم کے جوابات سننے کے لئے

تیار رہنا چاہئے" ماہرین قانون کی مختلف اقسام کو الگ کرنے کے لئے انھیں مختلف مکاتیب فکر میں تقسیم کیا جاتا ہے، مگر ان کی قسمیں اتنی زیادہ ہیں کہ بہت سے مصنفین اس طرح کی اختیار کردہ وسیع ترین تقسیم کی حد بندیوں میں بھی نہیں آتے، مثال کے طور پر جان آسٹن John Austin کے متعلق پروفیسر پیٹن G.W. Paton نے لکھا ہے کہ وہ ہماری وسیع قسم بندی (Broad Division) میں سے کسی ایک میں بھی پوری طرح موزوں نہیں بیٹھتا۔"

A Textbook of Jurisprudence, 1905, p. 5

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ماہرین قانون کو وہ صحیح اساس ہی نہیں ملی جس کی بنیاد پر وہ مطلوبہ قانون کی تشکیل کر سکیں، وہ قانون کے اندر جن ضروری قدروں کو یکجا کرنا چاہتے ہیں، جب وہ انھیں یکجا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ یکجا نہیں ہو رہی ہیں، اس سلسلے میں ماہر قانون کی مثال اس شخص کی سی ہے، جو مینڈکوں کی پنسیری بنا رہا ہو، ظاہر ہے کہ وہ پانچ مینڈکوں کو یکجا کرے گا تو دوسرے پانچ اس کے پلڑے میں سے پھدک کر نکل چکے ہوں گے، اس طرح معیاری قانون کو حاصل کرنے کی اب تک کوششیں صرف ناکامی پر ختم ہوئی ہیں، فرائڈمین W. Friedmann کے الفاظ میں :-

"یہ ایک حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب کو اس مسئلہ کا کوئی حل اب تک اس کے سوا نہیں مل سکا کہ وہ گاہ بگاہ ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف لڑھک جایا کرے۔"

Legal Theory, p. 18

جان آسٹن جس کی کتاب پہلی بار ۱۸۶۱ء میں شائع ہوئی، اس نے دیکھا کہ قوت نافذہ کے بغیر کوئی قانون، قانون نہیں بنتا، اس لئے اس نے قانون کی تعریف یہ کی :-

"قانون ایک حکم ہے جو سیاسی طور پر اعلیٰ شخص (Political Superior) نے سیاسی طور پر ادنیٰ شخص (Political Inferior) کے لئے نافذ کیا ہو۔"

A Text Book of Jurisprudence, p. 56

اس تعریف میں قانون بس ایک صاحبِ اقتدار کا فرمان Command of the Sovereign بن کر رہ گیا۔ (پیٹن ص ٦)

چنانچہ بعد کو اس پر شدید اعتراضات کئے گئے، نیز حکمرانوں کی بدعنوانی دیکھ کر ذہنوں میں یہ تصور ابھرا کہ قانون سازی میں قوم کی مرضی کو بنیادی حیثیت حاصل ہونی چاہئے، چنانچہ ایسے علمائے قانون پیدا ہوئے جنھوں نے کسی ایسے ضابطہ و قاعدہ کو قانون تسلیم کرنے سے انکار کیا جس کی پشت پر قوم کی رضامندی نہ ہو، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک ضابطہ تمام اہل علم اور معلمین اخلاق کے نزدیک صحیح اور مفید ہونے کے باوجود محض اس لئے رائج نہیں ہو سکتا کہ رائے عامہ اس کے خلاف ہے، مثلاً امریکہ میں شراب کی پابندی کے قانون کو امریکی قوم کی رضامندی نہ ملنے کی وجہ سے قانون کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی، اسی طرح برطانیہ میں قتل کی سزا میں ترمیم کرنی پڑی اور ہم جنسی جیسی قبیح حرکت کو قانون کی حد میں لانا پڑا، حالانکہ ملک کے جج اور سنجیدہ لوگ اس کے خلاف تھے، اسی طرح یہ بات بھی زبردست بحث کا موضوع رہی ہے، کہ قانون قابل تغیر ہے یا ناقابل تغیر ــــ قرون وسطیٰ اور زمانۂ مابعد تجدید Post Renaissance Period میں قانونِ طبعی یا قانونِ فطرت کو کافی فروغ حاصل ہوا، اس کا مطلب یہ تھا کہ انسان کی جو فطرت ہے، وہی قانون کا بہترین ماخذ ہے:ــ

"فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شے پر حکومت کا حق خود اسی کے فطری تقاضوں اور رہنما اصولوں کو پہونچتا ہے، اور انسان کے لئے قدرت نے یہ رہنما اصول اس کی عقل کی شکل میں پیدا کئے ہیں لہٰذا انسان پر حکومت خود اپنی عقل کے زور سے ہی قائم کی جاسکتی ہے۔"

Jurisprudence By Bodenheimer, p. 164

اس تصور نے قانون کو ایک آفاقی بنیاد فراہم کردی، یعنی وہ ایک ایسی چیز سمجھا جانے لگا جس کو ہمیشہ ایک ہی رہنا چاہئے، یہ سترہویں اور اٹھارہویں صدی کا تصور قانون تھا، اس کے بعد دوسرا مکتب فکر پیدا ہوا اور اس نے دعویٰ

کیا کہ قانون کے آفاقی قواعد معلوم کرنا بالکل ناممکن ہیں، کوہلر Kohler لکھتا ہے۔

"یہاں کوئی ابدی قانون (Eternal Law) نہیں ہے، ایک قانون جو ایک عہد کے لئے موزوں ہو، وہی لازمی طور پر دوسرے عہد کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا، ہم صرف اس بات کی کوشش کر سکتے ہیں کہ ہر کلچر کے لئے اس کے مناسب حال نظام قانون کو فراہم کریں، کوئی چیز جو ایک کے لئے خیر ہو، وہی دوسرے کے لئے مہلک ہو سکتی ہے۔"

Philosophy of Law, p. 5

اس تصور نے فلسفۂ قانون کا سارا استحکام ختم کر دیا، یہ تصور انسانی فکر کو اندھا دھند تغیر پذیری Relativism کی طرف لے جاتا ہے، اور چونکہ یہ کسی بنیاد سے محروم ہے، اس لئے اس کی کوئی منزل نہیں، یہ تصور زندگی کی تمام اقدار کو تلپٹ کر کے رکھ دیتا ہے، پھر ایک گروہ نے ہر طرف سے سمٹ کر عدل کے پہلو کو بہت زیادہ اہمیت دی — لارڈ رائٹ (Lord Wright) ڈین راسکو پاونڈ Dean Roscoe Pound کا ایک اقتباس نقل کرتے ہوئے لکھتا ہے:—

"راسکو پاونڈ ایک ایسی بات کہتا ہے، جس کی صداقت پر میں اپنے تمام تجربات اور قانونی مطالعہ کے نتیجے میں بالکل مطمئن ہو چکا ہوں، وہ یہ کہ قانون کا ابتدائی اور بنیادی مقصد انصاف کی تلاش (Quest of Justice) ہے۔"

Interpretation of Modern Legal Philosophies, New York 1947, p. 794

مگر یہاں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ انصاف کیا ہے، اور اس کو کیسے متعین کیا جا سکتا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ بات گھوم پھر کر دوبارہ وہیں پہونچ جاتی ہے، جہاں آسٹن کو ہم نے چھوڑا تھا، اس طرح سیکڑوں برس کی تلاش و تحقیق کے باوجود انسان اب تک قانون کی تشکیل کے لئے کوئی واقعی بنیاد فراہم نہ کر سکا، یہ احساس روز بروز بڑھ رہا ہے کہ جدید فلسفۂ مقاصد قانون کے اہم مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام رہا ہے، پروفیسر پیٹن

(George Whitecross Paton) لکھتے ہیں:۔

"کیا مفادات ((Interests) ہیں جن کا تحفظ ایک معیاری قانونی نظام کو کرنا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے، جو اقدار (Values) سے متعلق ہے، اور وہ فلسفۂ قانون کے دائرۂ بحث میں آتا ہے، مگر اس معاملے میں ہم فلسفے سے جتنی زیادہ مدد لینا چاہتے ہیں اتنا ہی اس کا حصول مشکل معلوم ہوتا ہے، کوئی بھی قابلِ قبول پیمانۂ اقدار (Scale of Values) اب تک دریافت نہیں ہو سکا ہے، درحقیقت صرف مذہب ہی میں ایسا ہے کہ ہم اس کی ایک بنیاد پا سکتے ہیں، مگر مذہب کی صداقتیں عقیدہ یا وجدان کے تحت قبول کی جاتی ہیں، نہ کہ منطقی استدلال کی بنیاد پر۔"

A Textbook of Jurisprudence, p. 104

آگے وہ کچھ علمائے قانون کا یہ خیال نقل کرتا ہے کہ وہ مدتوں فلسفۂ قانون کی بھول بھلیاں میں گردش کرنے کے بعد یہ کہنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ فلسفۂ قانون نے قانون کے مقصد کے فلسفیانہ مطالعہ کی جو کوشش کی ہے، وہ کسی نتیجہ تک نہیں پہنچتی (صفحہ ۱۰۶) پھر وہ سوال کرتا ہے ـــ "کیا کچھ معیاری اقدار Ideal Values ہیں، جو ارتقائے قانون میں اس کی رہنمائی کرتی ہیں" (صفحہ ۱۰۸) ایسی اقدار اگرچہ اب تک دریافت نہیں ہو سکیں لیکن وہ قانون کے لئے ناگزیر ہیں، مگر دقت یہ ہے کہ مذہب کو الگ کرنے کے بعد اس کے حصول کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

> "The Orthodox Natural Law Theory based its absolutes on the revealed truths of religion. If we attempt to secularise Jurisprudence, where can we find an agreed basis of values."
>
> p. 109

یہ طویل تجربہ انسان کو دوبارہ اسی طرف لوٹنے کا اشارہ کرتا ہے، جہاں سے اس نے انحراف کیا تھا، قدیم زمانے میں قانون کی تدوین و تشکیل میں مذہب کا بہت بڑا حصہ ہوتا تھا چنانچہ تاریخ قانون کا

ماہر سر ہنری مین (Sir Henry Maine) لکھتا ہے:۔

"تحریری طور پر منضبط قانون کا کوئی ایسا نظام، چین سے پیرو (Peru) تک ہمیں نہیں ملتا جو اپنے دور آغاز ہی سے مذہبی رسوم وعبادات کے ساتھ ہم رشتہ نہ رہا ہو۔"

Early Law and Custom, p. 5

اب وقت آگیا ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے کہ خدا کی رہنمائی کے بغیر انسان خود اپنے لئے قانون وضع نہیں کر سکتا، لاحاصل کوشش کو مزید جاری رکھنے کے بجائے اب ہمارے لئے بہتر ہوگا کہ ڈاکٹر فرائڈ مین کے الفاظ میں ہم اعتراف کر لیں کہ۔

"ان مختلف کوششوں کا جائزہ لیا جائے تو یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ انصاف کے حقیقی معیار کو معین کرنے کے لئے مذہب کی رہنمائی حاصل کرنے کے سوا دوسری ہر کوشش بے فائدہ ہوگی، اور انصاف کے مثالی تصور کو عملی طور پر متشکل کرنے کے لئے مذہب کی دی ہوئی اساس بالکل منفرد طور پر حقیقی اور سادہ بنیاد ہے۔"

Legal Theory, p. 450

مذہب کے اندر ہم کو وہ تمام بنیادیں نہایت صحیح شکل میں مل جاتی ہیں جو ایک معیاری قانون کے لئے ماہرین تلاش کر رہے ہیں، مگر وہ اب تک اسے نہ پا سکے۔

ا۔ قانون کا سب سے پہلا اور لازمی سوال یہ ہے کہ قانون کون دے، وہ کون ہو جس کی منظوری (Sanction) سے کسی قانون کو قانون کا درجہ عطا کیا جائے، ماہرین قانون اب تک اس سوال کا جواب حاصل نہ کر سکے اگر حاکم کو بحیثیت حاکم یہ مقام دیں تو نظری طور پر اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ ایک یا چند اشخاص کو دوسرے تمام لوگوں کے مقابلے میں یہ امتیازی حق کیوں دیا جائے اور نہ عملاً یہ مفید ہے کہ ایک شخص کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ وہ جو چاہے، قانون بنائے اور جس طرح چاہے نافذ کرے، اور اگر معاشرہ اور اجتماع کو "قانون ساز" قرار دیں تو یہ اور زیادہ مہمل بات ہے، کیونکہ معاشرہ بحیثیت مجموعی وہ علم وعقل ہی نہیں رکھتا جو قانون سازی

کے لئے ضروری ہے، قانون بنانے کے لئے بہت سی مہارتوں اور واقفیتوں کی ضرورت ہے جس کی نہ عام لوگوں میں صلاحیت ہوتی ہے اور نہ ان کو اتنا موقع ہوتا ہے کہ وہ ان میں درک حاصل کرسکیں، اسی طرح عملاً بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ معاشرہ کی کوئی ایسی رائے معلوم کی جاسکے جو سارے معاشرہ کی اپنی رائے ہو۔

موجودہ زمانے میں اس مسئلے کا یہ حل نکالا گیا ہے کہ پوری آبادی کے عاقل اور بالغ افراد اپنے نمائندے منتخب کریں اور یہ منتخب لوگ اجتماع کے نمائندے کی حیثیت سے اجتماع کے لئے قانون بنائیں، مگر اس اصول کی غیر معقولیت اسی سے ظاہر ہے کہ ۵۱ فی صدی کو صرف دو عدد کی اکثریت کی بنا پر یہ حق مل جاتا ہے کہ وہ ۴۹ فی صدی کی نام نہاد اقلیت پر حکمرانی کریں، مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس طریقے کے اندر اتنے خلا ہیں کہ عموماً ۵۱ فی صدی کی اکثریت بھی حاصل نہیں ہوتی اور مطلق اقلیت کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ اکثریت کے اوپر حکومت بنائے، مثال کے طور پر ہندوستان میں اس وقت ہم جس حکومت کے تحت ہیں، وہ ۱۹۶۲ء میں تیسرے عام الکشن کے ذریعہ برسر اقتدار آئی ہے، کانگریس کو ملک میں یہ اقتدار ۷۰ فیصدی نشستوں پر قبضہ کرکے حاصل ہوا ہے، جبکہ اس کو ووٹ صرف چالیس فیصدی ملے تھے، یہی حال آزادی کے بعد پچھلے دونوں الکشنوں کا بھی تھا، ہر بار کانگرس کو پچاس فیصدی سے کم ووٹ ملے، مگر اس کے باوجود ہر بار اسی نے حکومت بنائی اس کی وجہ یہ ہے کہ بقیہ ووٹ پچاس فیصدی سے زائد ہونے کے باوجود مختلف پارٹیوں میں بٹے ہوئے تھے، اور کسی ایک پارٹی کے مقابلے میں کانگرس کے رائے دہندگان کی تعداد زیادہ تھی، صرف اشتراکی ملکوں کے مصنوعی انتخابات اس سے مستثنیٰ ہیں۔

اس طرح فلسفۂ قانون کو آج تک اس مسئلہ کا کوئی واقعی حل معلوم نہ ہوسکا، مذہب اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ قانون کا ماخذ خدا ہے، جس نے زمین و آسمان کا اور ساری طبیعی دنیا کا قانون مقرر کیا ہے، اسی کو حق ہے کہ وہ انسان کے تمدن و معاشرت کا قانون وضع کرے، اس کے سوا کوئی بھی نہیں ہے جس کو یہ حیثیت دی جاسکے، یہ جواب اتنا سادہ اور معقول ہے کہ وہ خود ہی بول رہا ہے کہ اس کے سوا اس مسئلہ کا کوئی اور جواب

نہیں ہو سکتا، یہ جواب اس سوال پر اسی طرح بالکل راست آرہا ہے، جیسے کوئی ڈھکن غلط شیشیوں پر بیٹھ نہ رہا ہو اور جیسے ہی اس کے اصل مقام پر اسے لایا جائے وہ ٹھیک اس پر بیٹھ جائے۔

اس جواب میں قانون بنانے اور حکم دینے کا حق ٹھیک اس جگہ پہونچ گیا جہاں نہ پہونچنے کی وجہ سے ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہم اس کو کہاں لے جائیں، انسانوں کے اوپر انسان کو حاکم اور قانون ساز نہیں بنایا جا سکتا، اس کا حق تو صرف اسی کو ہے جو سارے انسانوں کا خالق اور بالفعل ان کا طبیعی حاکم ہے۔

۲۔ قانون کا ایک بہت بڑا سوال یہ ہے کہ کیا اس کا سارا حصہ اضافی ہے یا اس کا کوئی جزو حقیقی نوعیت بھی رکھتا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہر وہ قانون جو آج رائج ہے کل بدلا جا سکتا ہے یا اس کا کوئی حصہ ایسا بھی ہے جو ناقابل تغیر ہے، اس سلسلے میں طویل ترین بحثوں کے باوجود آج تک کوئی قطعی بنیاد حاصل نہ ہو سکی، علمائے قانون اصولی طور پر اس کو ضروری سمجھتے ہیں کہ قانون میں ایک ایسا عنصر ضروری ہے جو دوامی نوعیت رکھتا ہو، اور اسی کے ساتھ اس میں ایسے اجزا بھی ہونے چاہئیں جن میں لچک ہو تاکہ بدلتے ہوئے حالات پر انھیں بآسانی منطبق کیا جا سکے —— دونوں میں سے کسی ایک پہلو کی کمی بھی قانون کے لئے سخت مضر ہے، امریکہ کے ایک جج مسٹر کارڈوزو (Justice Cardozo) لکھتے ہیں:۔

> "آج قانون کی اہم ترین ضروریات میں سے ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ ایک ایسا فلسفۂ قانون مرتب کیا جائے جو ثبات اور تغیر کے متحارب تقاضوں کے درمیان توافق پیدا کرے۔"
>
> *(The Growth of the Law)*

ایک اور عالم قانون لکھتا ہے:۔

> "قانون کو ضرور مستحکم ہونا چاہئے، لیکن اس کے باوجود اس میں جمود نہیں پیدا ہونا چاہئے، اسی وجہ سے قانون کے متعلق مفکرین نے اس بارے میں کافی جدوجہد کی ہے کہ کس طرح استحکام اور تبدیلی کے دوطرفہ تقاضوں میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔"
>
> Roscoe Pound, *Interpretation of Legal History*, p. 1

مگر حقیقت یہ ہے کہ انسانی قوانین میں اس قسم کا فرق پیدا کرنا ناممکن ہے، کیونکہ قانون کے کسی حصہ کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ دائمی اور ناقابل تغیر ہے، کوئی دلیل چاہتا ہے، اور انسانی قانون ایسی کوئی دلیل پیش کرنے سے عاجز ہے، آج کچھ لوگ ایک قانون کو اپنی عقل سے دائمی قرار دیں گے، اور کل کچھ لوگوں کی عقل کو نظر آئے گا کہ وہ دائمی ہونے کے قابل نہیں ہے، اور وہ دوبارہ اس کے قابلِ تغیر ہونے کا اعلان کر دیں گے۔

خدا کا قانون ہی اس مسئلے کا واحد حل ہے، خدا کا قانون ہم کو وہ تمام بنیادی اصول دے دیتا ہے جو غیر متبدل طور پر ہمارے قانون کا لازمی جزء ہونے چاہئیں، یہ قانون کچھ بنیادی امور کے بارے میں بنیادی پہلوؤں کا تعین کرتا ہے، اور بقیہ امور اور دیگر پہلوؤں کے بارے میں خاموش ہے، اس طرح وہ اس فرق کا تعین کر دیتا ہے کہ قانون کا کون سا حصہ دائمی ہے، اور کون سا حصہ قابلِ تغیر ہے، پھر وہ خدا کا قانون ہونے کی وجہ سے اپنے ساتھ یہ ترجیحی دلیل بھی رکھتا ہے کہ کیوں ہم اس تعین کو مبنی بر حق سمجھیں اور اس کو لازمی قرار دیں۔

یہ خدائی قانون کی ایک بہت بڑی دین ہے، بلکہ ایک ایسی دین ہے جس کا بدل فراہم کرنا انسان کے لئے قطعی ناممکن ہے۔

۳۔ اسی طرح قانون کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اس بات کی کوئی معقول وجہ موجود ہو کہ وہ کیوں کسی چیز کو "جرم" قرار دیتا ہے ـــــ انسانی قانون کے پاس اس کا جواب یہ ہے کہ جو عمل "امن عامہ یا نظم مملکت" میں خلل ڈالتا ہو وہ جرم ہے، اس کے بغیر اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی فعل کو جرم کیسے قرار دے، یہی وجہ ہے کہ قوانین مروجہ کی نگاہ میں زنا اصلاً جرم نظر نہیں آتا بلکہ وہ صرف اس وقت جرم بنتا ہے، جبکہ طرفین میں سے کسی نے دوسرے پر جبر کیا ہو، گویا انسانی قانون کے نزدیک اصل جرم زنا نہیں بلکہ جبر و اکراہ ہے ـــــ جس طرح زبردستی کسی کے مال پر ہاتھ ڈالنا جرم ہے، اسی طرح زبردستی اس کی آبرو پر دست درازی بھی جرم ہے، لیکن باہمی رضامندی سے جس طرح ایک کا مال دوسرے کے لئے جائز ہو جاتا ہے، اسی طرح گویا قانون کی نظر میں فریقین کی رضامندی سے ایک کی عصمت بھی دوسرے پر حلال ہو جاتی ہے، اس باہمی رضامندی

کی شکل میں قانون، زنا کا حامی و محافظ بن جاتا ہے، اور اگر تیسرا شخص مداخلت کر کے زبردستی انھیں روکنا چاہے تو الٹا وہی شخص مجرم بن جائے گا۔

زنا کا ارتکاب سوسائٹی میں زبردست فساد پھیلاتا ہے، وہ ناجائز اولاد کے مسائل پیدا کرتا ہے، وہ رشتۂ نکاح کو کمزور کر دیتا ہے، وہ سطحی لذتیت کا ذہن پیدا کرتا ہے، وہ چوری اور خیانت کی تربیت کرتا ہے، وہ قتل اور اغوا کو فروغ دیتا ہے، وہ سارے سماج کے دل و دماغ کو گندا کر دیتا ہے، مگر اس کے باوجود قانون اسے کوئی سزا نہیں دے سکتا، کیونکہ اس کے پاس زنا بالرضا کو جرم قرار دینے کے لئے کوئی بنیاد نہیں ہے۔

اسی طرح انسانی قانون کے لئے یہ طے کرنا مشکل ہے کہ وہ شراب نوشی کو جرم کیوں قرار دے، کیونکہ اکل و شرب انسان کا ایک فطری حق ہے، اس لئے وہ جو چاہے کھائے، اس میں قانون کو مداخلت کرنے کی کیا ضرورت، اس لئے اس کے نزدیک نہ شراب پینا جرم ہے اور نہ اس سے پیدا شدہ بدمستی اصلاً قابل مواخذہ ہے، البتہ نشے کی حالت میں اگر مخمور کسی سے گالم گلوج کر بیٹھا یا ہاتھا پائی کی نوبت آگئی، یا شارع عام پر وہ اس طرح جھومتا ہوا چلا کہ خمار اس کی حرکات سے بالکل نمایاں تھا، تب کہیں جا کر قانون اس پر ہاتھ ڈالنا جائز سمجھے گا، گویا انسانی قانون کی رو سے فی الحقیقت شراب نوشی کا فعل قابل گرفت نہیں ہے، بلکہ اصل قابل گرفت جرم دوسروں کو ایک خاص شکل میں ایذا پہونچانا ہے۔

شراب نوشی صحت کو تباہ کرتی ہے، وہ مال کے ضیاع اور بالآخر اقتصادی بربادی تک لے جا سکتی ہے، اس سے اخلاق کا احساس کمزور پڑتا ہے، اور انسان دھیرے دھیرے حیوان بن جاتا ہے، شراب مجرمین کی ایک بہترین مددگار ہے، جس کو پینے کے بعد لطیف احساسات مفلوج ہو جاتے ہیں، اور پھر قتل، چوری، ڈاکہ اور عصمت دری کے واقعات کرنا آسان ہو جاتا ہے، یہ سب کچھ ہوتا ہے، مگر قانون اسے بند نہیں کر سکتا، کیوں کہ اس کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے کہ وہ کیوں لوگوں کے اختیاری اکل و شرب پر پابندی عائد کرے۔

اس مشکل کا جواب صرف خدا کے قانون میں ہے، کیونکہ خدا کا قانون مالک کائنات کی مرضی کا اظہار ہوتا ہے، کسی قانون کا خدا کا قانون ہونا بذات خود اس بات کی کافی وجہ ہے کہ وہ بندوں کے اوپر نافذ ہو اس کے بعد اس کے لئے کسی اور سبب کی ضرورت نہیں، اس طرح خدائی قانون، قانون کی اس ضرورت کو پورا کرتا ہے کہ کس بنیاد پر کس فعل کو قانون کی زد میں لایا جائے۔

۴۔ قانون کبھی خود مکتفی نہیں ہو سکتا، مختلف وجوہ کی بنا پر اس کے ساتھ اخلاق کا ہم رشتہ ہونا ضروری ہے۔

(الف) مثلاً ایک مقدمہ قانون کے سامنے آتا ہے، اس وقت اگر خالص سچائی منظر عام پر نہ آئے تو قانون کا عادلانہ مقصد کبھی پورا نہیں ہو سکتا، اگر فریقین اور گواہ عدالتوں میں سچ بولنے سے گریز کریں تو انصاف کا خاتمہ ہو جائے گا، اور اس کے قیام کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہوں گی گویا قانون کے ساتھ کسی ایسے ماورائے قانون تصور کی بھی لازمی ضرورت ہے، جو لوگوں کے لئے سچ بولنے کا محرک بن سکے، سچائی کے لازمۂ قانون وانصاف ہونے کا اعتراف دنیا بھر کی عدالتیں اس طرح کرتی ہیں کہ وہ ہر گواہ کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ سچ بولنے کی قسم کھائے اور حلف اٹھا کر اپنا بیان دے، قانون کے لئے مذہبی اعتقادات کی اہمیت کی یہ ایک نہایت واضح مثال ہے، مگر جدید سوسائٹی میں مذہب کی حقیقی اہمیت چونکہ ہر پہلو سے ختم کر دی گئی ہے، اس لئے عدالتوں کی مذہبی قسمیں اب صرف ایک روایت بلکہ مسخرہ پن بن کر رہ گئی ہیں، اور ان کا کوئی واقعی فائدہ باقی نہیں رہا ہے۔

(ب) اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ قانون جس فعل کو جرم قرار دے کر اس پر سزا دینا چاہتا ہے، اس کے بارے میں خود سماج کے اندر بھی یہ احساس موجود ہو کہ یہ فعل جرم ہے، محض قانونی کوڈ میں چھپے ہوئے الفاظ کی بنا پر وہ فضا پیدا نہیں ہو سکتی، جو کسی جرم پر سزا کے اطلاق کے لئے درکار ہے، ایک شخص جب جرم کرے تو اس کے اندر مجرمانہ ذہن Guilty Mind کا پایا جانا ضروری ہے، وہ خود اپنے آپ کو مجرم سمجھے اور سارا سماج اس کو مجرم کی نظر سے دیکھے، پولیس پورے اعتماد کے ساتھ اس پر دست اندازی

کرے، عدالت میں بیٹھنے والا جج پوری آمادگیٔ قلب کے ساتھ اس پر سزا کا حکم جاری کرے، دوسرے لفظوں میں ایک فعل کے "جرم" ہونے کے لئے اس کا "گناہ" ہونا ضروری ہے، قانون کے تاریخی مکتبِ فکر کا یہ کہنا کہ "قانون سازی جبھی کامیاب ہوسکتی ہے جبکہ وہ اس نسل کے داخلی اعتقادات (Internal Convictions) کے مطابق ہو جس کے لئے قانون وضع کیا گیا ہے، اگر وہ اس سے غیر متعلق ہو تو ایسے قانون کا ناکام ہونا یقینی ہے"[1] اپنے مخصوص مکتبِ فکر کے استدلال کے طور پر تو صحیح نہیں ہے مگر اس میں ایک خارجی صداقت بیشک موجود ہے۔

(ج) ان سب چیزوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قانون کے عمل درآمد سے پہلے سماج کے اندر ایسے محرکات موجود ہوں جو لوگوں کو جرم کرنے سے روکتے ہوں، صرف پولیس اور عدالت کا خوف اس کے لئے کافی محرک نہیں بن سکتا، کیونکہ پولس اور عدالت کے اندیشہ سے تو رشوت، سفارش، غلط وکالت اور جھوٹی گواہیاں بھی بچا سکتی ہیں، اور اگر ان چیزوں کو استعمال کرکے کوئی شخص اپنے آپ کو جرم کے قانونی انجام سے بچالے جائے تو پھر اسے مزید کوئی اندیشہ باقی نہیں رہتا۔

خدائی قانون میں ان تمام چیزوں کا جواب موجود ہے، خدائی قانون کے ساتھ مذہب و آخرت کا عقیدہ وہ ماورائے قانون فضا پیدا کرتا ہے، جو لوگوں کو سچائی پر ابھارے، وہ اس درجہ موثر ہے کہ اگر کوئی شخص وقتی مفاد کے تحت جھوٹا حلف اٹھائے تو اپنے دل کو ملامت سے نہیں بچا سکتا، ولیسٹرن سرکٹ کی عدالت میں ایک پتھر نصب ہے جو اس واقعہ کی یاد تازہ کرتا ہے کہ ایک گواہ نے قسم کے عام کلمات دہرانے کے بعد یہ بھی کہا تھا کہ "اگر میں جھوٹ بولوں تو خدا میری جان یہیں قبض کرے" چنانچہ وہ شخص وہیں دھڑام سے گرا اور گر کر اس کا خاتمہ ہو گیا[2] اس طرح کے واقعات اور بھی پیش آئے ہیں، اسی طرح جرم کے فعل شنیع ہونے کا عام احساس بھی محض اسمبلی کے پاس کردہ ایکٹوں کے ذریعہ پیدا نہیں ہو سکتا، اس کی بھی واحد بنیاد خدا اور آخرت کا عقیدہ ہے، اسی طرح جرم نہ کرنے کا محرک بھی صرف مذہب ہی پیدا کرسکتا ہے، کیونکہ مذہب

---

[1] *A Textbook of Jurisprudence*, p. 15 [2] *The Changing Law*, p.103

صرف قانون نہیں دیتا بلکہ اسی کے ساتھ یہ تصور بھی لاتا ہے کہ جس نے یہ قانون عائد کیا ہے وہ تمہاری پوری زندگی کو دیکھ رہا ہے، تمہاری نیت، تمہارا قول، تمہاری تمام حرکتیں اس کے ریکارڈ میں مکمل طور پر ضبط ہو چکی ہیں، مرنے کے بعد تم اس کے سامنے پیش کئے جاؤ گے اور تمہارے لئے ممکن نہ ہوگا کہ تم اپنے جرائم پر پردہ ڈال سکو، آج اگر سزا سے بچ گئے تو وہاں کی سزا سے کسی طرح بچ نہیں سکتے، بلکہ دنیا میں اپنے جرم کی سزا سے بچنے کے لئے اگر تم نے غلط کوششیں کیں تو آخرت کی عدالت میں تمہارے اوپر دہرا مقدمہ چلے گا، اور وہاں ایک ایسی سزا ملے گی جو دنیا کی سزا کے مقابلے میں کروروں گنا سخت ہے۔

۵۔ انگلستان کی تاریخ کا ایک واقعہ ہے، جیمز اول James I نے اعلان کیا کہ وہ مطلق العنان بادشاہ کی طرح حکومت کر سکتا ہے، اور عدالتوں میں استغاثہ اور مرافعہ کے بغیر معاملات میں آخری فیصلے دے سکتا ہے، یہ مشہور چیف جسٹس لارڈ کوک (Coke) کا زمانہ تھا، وہ ایک مذہبی آدمی تھے، اور اپنے دن کا ایک چوتھائی حصہ عبادت میں بسر کیا کرتے تھے، انھوں نے بادشاہ سے کہا "تمہیں فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، تمام مقدمات عدالت میں جانے چاہئیں" بادشاہ نے کہا "میرا خیال ہے اور یہی میں نے سنا بھی ہے کہ تمہارے قوانین کی بنیاد عقل پر رکھی گئی ہے، تو کیا مجھ میں ججوں سے کم تر عقل ہے"، چیف جسٹس نے جواب دیا "تم بلاشبہ بہت علم و صلاحیت کے مالک ہو، لیکن قانون کے لئے بڑے تجربے اور مطالعہ کی ضرورت ہے، یہ تو ایک سنہرا پیمانہ ہے، جس سے رعایا کے حقوق کی پیمائش کی جاتی ہے، اور خود جناب والا کی حفاظت کی جاتی ہے" بادشاہ نے انتہائی غصہ ہو کر کہا "کیا میں بھی قانون کے ماتحت ہوں، ایسا کہنا تو غداری ہے" لارڈ کوک نے برکٹن (Bracton) کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔

"بادشاہ کسی آدمی کا ماتحت نہیں، مگر وہ خدا اور قانون کا ماتحت ہے۔"

The Changing Law by Sir Alfred Denning (1953) p. 117-118

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم خدا کو قانون سے الگ کر دیں تو ہمارے پاس یہ کہنے کی کوئی معقول بنیاد

نہیں رہتی کہ ــــــ "بادشاہ قانون کے ماتحت ہے" کیونکہ جن افراد نے خود اپنی رایوں سے قانون بنایا ہو جن کے اذن (Sanction) سے وہ قانونی طور پر جاری ہوا ہو، جو اس کو باقی رکھنے یا بدلنے کا حق رکھتے ہوں آخر کس بنا پر وہ اس کے ماتحت ہو جائیں گے، جب انسان ہی قانون ساز ہو تو بالکل فطری طور پر وہ خدا اور قانون دونوں کا جامع ہو جاتا ہے، وہ خود ہی خدا اور خود ہی قانون ہوتا ہے، ایسی حالت میں قانون سازوں کو قانون کے دائرے میں لانے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

یہی وجہ ہے کہ تمام جمہوریتوں میں شہری مساوات کے اصول کو تسلیم کرنے کے باوجود قانونی طور پر سب یکساں نہیں ہیں، اگر آپ ہندوستان کے صدر، گورنر، وزیر یا کسی افسر اعلیٰ پر مقدمہ چلانا چاہیں تو آپ اسی طرح اس کے خلاف مقدمہ نہیں چلا سکتے جیسے ایک عام شہری کے خلاف آپ کر لیتے ہیں، بلکہ ایسے کسی مقدمے کو عدالت میں لے جانے سے پہلے حکومت سے اس کی اجازت لینی ہوگی، دستور ہند کی دفعہ ۳۶۱ کے تحت صدر جمہوریہ اور ریاستوں کے گورنر کے لئے یہ تحفظ دیا گیا ہے کہ پارلیمنٹ کی اجازت کے بغیر کسی عدالت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ان کے خلاف کسی دعوے کی سماعت کر سکے، اسی طرح وزراء کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کے لئے حکومت سے پیشگی اجازت حاصل کرنا ضروری ہے، بلکہ تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۹۷ کی رو سے "کوئی جج، مجسٹریٹ یا کوئی سرکاری ملازم، جو مرکزی یا صوبائی حکومت کی اجازت کے بغیر اپنے عہدہ سے معزول نہ کیا جا سکتا ہو، اگر اس کے خلاف کسی بدعنوانی کے ارتکاب کا الزام لگایا جائے تو اس کی سماعت کا حق کسی عدالت کو اس وقت تک نہیں ہے، جب تک مرکزی یا ریاستی حکومت سے اس کی اجازت حاصل نہ کر لی جائے، جس سے کہ اس شخص کی ملازمت متعلق ہے" دوسرے لفظوں میں اگر آپ کسی اعلیٰ سیاسی یا انتظامی شخصیت پر مقدمہ چلانا چاہیں تو خود اسی سے پوچھنا ہوگا کہ آپ کے اوپر مقدمہ چلایا جائے یا نہیں۔

یہ ہندوستان کے قانونی نظام کا نقص نہیں ہے بلکہ انسانی قانون کا نقص ہے، اور یہ نقص ہر اس جگہ پایا جاتا ہے، جہاں انسانی قانون سازی کا اصول رائج ہے، صرف خدائی قانون میں یہ ممکن ہے کہ ہر شخص

کی حیثیت قانون کی نظر میں یکساں ہو، اور ایک حاکم پر اسی طرح عدالت میں مقدمہ چلایا جاسکے جس طرح محکوم پر چلایا جاتا ہے، کیونکہ ایسے نظام میں قانون ساز خدا ہوتا ہے، بقیہ تمام لوگ یکساں طور پر زیر قانون۔

۶۔ قانون کی آخری اور سب سے بڑی خصوصیت جس کو ہمارے ماہرین صدیوں سے تلاش کر رہے ہیں، اور اب تک وہ اسے حاصل نہ کرسکے وہ بھی صرف مذہبی قانون میں موجود ہے ___ یعنی قانون کی منصفانہ بنیاد، یہ سمجھا جاتا ہے کہ منصفانہ قانون کی بنیاد کا حاصل نہ ہونا تلاش کے نامکمل ہونے کا ثبوت ہے، نہ کہ اس بات کا ثبوت کہ انسان اسے حاصل ہی نہیں کرسکتا، مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ طبعی قوانین کی دریافت میں انسان نے بے حساب ترقی کی ہے، اور اس کے مقابلے میں تمدنی قوانین کی دریافت میں اس درجہ کی بلکہ اس سے زیادہ کوششوں کے باوجود ایک فی صدی بھی کامیابی نہیں ہوئی، تو ہم یہ ماننے پر مجبور ہوتے ہیں کہ یہ محض تلاش کے نامکمل ہونے کا ثبوت نہیں ہے، بلکہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جو چیز تلاش کی جارہی ہے اس کا پانا انسان کے بس ہی میں نہیں۔

دنیا میں سب سے پہلا فوٹو ایک فرانسیسی سائنس داں نے ۱۸۲۶ء میں کھینچا، اس میں آٹھ گھنٹے کا وقت لگا اور اس نے اپنے کمرے کے برآمدے کا فوٹو کھینچا تھا لیکن تصویر کشی کی موجودہ رفتار کا حال یہ ہے کہ فلم کا متحرک کیمرا ایک سکنڈ میں دو ہزار سے بھی زیادہ تصویریں کھینچ لیتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے جتنی دیر میں صرف ایک تصویر کھینچی جاسکتی تھی، اتنی دیر میں آج چھ کرور تصویریں لی جاسکتی ہیں، گویا رفتار کے معاملے میں ۱۴۰ سال میں انسان نے چھ کرور گنا ترقی کی ہے، امریکہ میں بیسویں صدی کے آغاز میں سارے ملک میں صرف چار موٹر کاریں تھیں اب تقریباً دس کرور کاریں وہاں کی سڑکوں پر دوڑتی ہیں، انسان کی باریک بینی کا یہ حال ہے کہ آج وہ ......۱/ا سکنڈ کو بھی ہزارویں حصے تک تقسیم کرسکتا ہے یعنی ایک سکنڈ کے دس لاکھویں حصے کا ہزارواں حصہ، چنانچہ زمین کی گردش میں فرق پڑنے سے اگر ایک سکنڈ کے دس لاکھویں حصے کے بقدر دن چھوٹا یا بڑا ہو تو رصد گاہوں میں اسے معلوم کرلیا جاتا ہے، آج ایسے حساس آلے

دریافت ہوچکے ہیں کہ اگر تیس جلدوں کی انسائیکلوپیڈیا میں کسی ایک صفحہ پر دو الفاظ بڑھائے جائیں تو اس کی سیاہی سے وزن میں جو فرق پڑے گا، اس کو وہ فوراً بتادیں گے ــــ یہ طبیعی قوانین کی دریافت میں انسان کی ترقی کا حال ہے، مگر جہاں تک تمدنی قوانین کا معاملہ ہے، وہ اس میں ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکا۔

یہاں میں چند مثالیں دوں گا جس سے اندازہ ہوگا کہ یہ دعویٰ کس قدر صحیح ہے کہ صرف خدائی مذہب ہی وہ حقیقی بنیاد ہے، جس سے ہم انسانی زندگی کا قانون اخذ کرسکتے ہیں۔

معاشرت

اسلام کی نظر میں عورت مرد دونوں برابر نہیں ہیں، چنانچہ اس نے دونوں صنفوں کے درمیان آزادانہ اختلاط کو سخت ناپسند کیا ہے اور اس کو بند کرنے کا حکم دیا ہے، اس کے بعد جب صنعتی دور شروع ہوا تو اس اصول کا بہت مذاق اڑایا گیا، اور اس کو دورِ جہالت کی یادگار قرار دیا گیا، بڑے زور شور سے یہ بات کہی گئی کہ عورت مرد دونوں یکساں ہیں، اور دونوں مساوی طور پر نسلِ انسانی کے وارث ہیں، ان کے میل جول کے درمیان کوئی دیوار کھڑی کرنا ایک جرم عظیم ہوگا، چنانچہ ساری دنیا میں، اور خاص طور سے مغرب میں اس اصول پر ایک نئی سوسائٹی ابھرنا شروع ہوئی، مگر طویل تجربے نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ پیدائشی طور پر دونوں یکساں نہیں ہیں، اس لئے دونوں کو یکساں فرض کرکے جو سماج بنایا جائے وہ لازمی طور پر بے شمار خرابیاں پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔

پہلی بات یہ کہ عورت اور مرد میں فطری صلاحیتوں کے زبردست نوعی اختلافات ہیں اس لئے دونوں کو مساوی حیثیت دینا اپنے اندر ایک حیاتیاتی تضاد رکھتا ہے، ڈاکٹر الکسس کیرل، عورت اور مرد کے فعلیاتی (Physiological) فرق کو بتاتے ہوئے لکھتا ہے۔

مرد اور عورت کا فرق محض جنسی اعضا کی خاص شکل، رحم کی موجودگی، حمل یا طریقۂ تعلیم ہی کی وجہ سے

نہیں ہے، بلکہ یہ اختلافات بنیادی قسم کے ہیں، خودنسیجوں کی بناوٹ اور پورے نظام جسمانی کے اندر خاص کیمیائی مادے جو خصیۃ الرحم سے سترشح ہوتے رہتے ہیں' ان اختلافات کا حقیقی باعث ہیں' صنف نازک کے ترقی کے حامی ان بنیادی حقیقتوں سے ناواقف ہونے کی بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ دونوں جنسوں کو ایک ہی قسم کی تعلیم' ایک ہی قسم کے اختیارات اور ایک ہی قسم کی ذمہ داریاں ملنی چاہئیں' حقیقت یہ ہے کہ عورت' مرد سے بالکل ہی مختلف ہے' اس کے جسم کے ہر ایک خلیے میں زنانہ پن کا اثر موجود ہوتا ہے' اس کے اعضا اور سب سے بڑھ کر اس کے اعصابی نظام کی بھی یہی حالت ہوتی ہے۔ فعلیاتی توانین۔۔۔ (Physiological Laws) اتنے ہی اٹل ہیں، جتنے کہ فلکیات (Sidereal World) کے توانین اٹل ہیں' انسانی آرزوؤں سے ان کو بدلا نہیں جاسکتا، ہم ان کو اسی طرح ماننے پر مجبور ہیں' جس طرح وہ پائے جاتے ہیں' عورتوں کو چاہئے کہ اپنی فطرت کے مطابق اپنی صلاحیتوں کی ترقی دیں اور مردوں کی نقالی کرنے کی کوشش نہ کریں۔"

Man the Unknown, p. 93

عملی تجربہ بھی اس فرق کی تصدیق کر رہا ہے، چنانچہ زندگی کے کسی شعبہ میں بھی اب تک عورت کو مرد کے برابر درجہ نہ مل سکا حتیٰ کہ وہ شعبے جو خاص طور پر عورتوں کے شعبے سمجھے جاتے ہیں' وہاں بھی مرد کو عورت کے اوپر فوقیت حاصل ہے، میری مراد فلمی ادارے سے ہے، نہ صرف یہ کہ فلمی اداروں کی تنظیم تمام تر مردوں کے ہاتھ میں ہے بلکہ اداکاری کے اعتبار سے بھی مرد کی اہمیت عورت سے زیادہ ہے، چنانچہ آج ایک مشہور ترین فلم ایکٹر ایک فلم کے لئے چھ لاکھ روپے لیتا ہے، جبکہ مشہور ترین فلم ایکٹرس کو چار لاکھ ملتے ہیں۔

مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے' اگر ہم طبیعی اور فلکیاتی توانین کو تسلیم نہ کریں اور ان کے خلاف چلنا شروع کر دیں تو یہ صرف ایک واقعہ کا انکار ہی نہیں ہوگا بلکہ ہمارا سر بھی ٹوٹ جائے گا، اسی طرح عورت اور مرد کی جداگانہ حیثیات کو نظر انداز کر کے انسان نے جو نظام بنایا، اس نے تمدن کے اندر زبردست خرابیاں پیدا

کردیں، مثال کے طور پر اس غلط فلسفے کی وجہ سے دونوں صنفوں کے درمیان جو آزادانہ اختلاط پیدا ہوا ہے، اس نے جدید سوسائٹی میں نہ صرف عصمت کا وجود باقی نہیں رکھا، بلکہ ساری نوجوان نسل کو طرح طرح کی اخلاقی اور نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا کر دیا ہے، آج مغربی زندگی میں یہ بات عام ہے کہ ایک غیر شادی شدہ لڑکی ڈاکٹر کے کمرہ میں داخل ہوتی ہے، اس کو سر درد اور بے خوابی کی شکایت ہے، وہ کچھ دیر اپنی ان تکلیفات پر گفتگو کرتی ہے، اس کے بعد ایک مرد کا ذکر شروع کر دیتی ہے جس سے ابھی وہ جلد ہی ملی تھی، اتنے میں ڈاکٹر محسوس کرتا ہے کہ وہ کچھ رک رہی ہے، تجربہ کار ڈاکٹر اس کی بات سمجھ کر آگے بات شروع کر دیتا ہے:۔

Well, then he asked you to his flat. What did you say?

لڑکی جواب دیتی ہے۔

How did you know? I was just going to tell you that,

اس کے بعد لڑکی جو کچھ کہتی ہے، اس کو ناظرین خود قیاس کر سکتے ہیں، چنانچہ علمائے جدید خود بھی اس تلخ تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آزادانہ اختلاط کے بعد عصمت و عفت کا تحفظ ایک بے معنی بات ہے چنانچہ اس کے خلاف کثرت سے مضامین اور کتابیں شائع کی جا رہی ہیں، ایک مغربی ڈاکٹر کے الفاظ ہیں:۔

There can come a moment between a man and a woman when control and judgment are impossible.

یعنی اجنبی مرد اور اجنبی عورت جب باہم آزادانہ مل رہے ہوں تو ایک وقت ایسا آجاتا ہے، جب فیصلہ کرنا اور قابو رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ عورت اور مرد کے آزادانہ اختلاط کی خرابیوں کو مغرب کے دردمند افراد شدت سے محسوس کر رہے ہیں، مگر اس کے باوجود وہ اس سے اس قدر مرعوب ہیں کہ اصل بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی، ایک نہایت قابل اور مشہور خاتون ڈاکٹر میرین ہلیرڈ (Marrion Hilliard) نے آزادانہ اختلاط کے خلاف سخت مضمون لکھا ہے، وہ کہتی ہیں:۔

As a doctor I don't believe there is such a thing as platonic relationship between a man and a woman who are alone together a good deal.

یعنی بحیثیت ڈاکٹر میں اسے تسلیم نہیں کر سکتی کہ عورت اور مرد کے درمیان بے ضرر تعلقات بھی ممکن ہیں، مگر اس کے باوجود یہی خاتون ڈاکٹر لکھتی ہیں:۔

"میں اتنی غیر حقیقت پسند نہیں ہو سکتی کہ یہ مشورہ دوں کہ نوجوان لڑکے اور نوجوان لڑکیاں ایک دوسرے کا بوسہ لینا چھوڑ دیں، مگر اکثر مائیں اپنی لڑکیوں کو اس سے آگاہ نہیں کرتیں کہ بوسہ صرف اشتہا پیدا کرتا ہے نہ کہ وہ جذبات کو تسکین دیتا ہے۔" (ریڈرز ڈائجسٹ، دسمبر ۱۹۵۷ء)

خاتون ڈاکٹر یہ کہہ کر بالواسطہ طور پر خدائی قانون کو تسلیم کرتی ہے کہ آزادانہ اختلاط کے ابتدائی مظاہر جو مغربی زندگی میں نہایت عام ہیں، وہ جذبات میں ٹھہراؤ پیدا نہیں کرتے، بلکہ اشتہا کو بڑھا کر مزید تسکین نفس کی طرف ڈھکیلتے ہیں اور بالآخر انتہائی جنسی جرائم تک پہنچا دیتے ہیں، مگر اس کے باوجود اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس محرک شیطنت کو کس طرح حرام قرار دے۔

۲۔ اسی طرح اسلام میں ایک سے زیادہ شادی کرنے کی اجازت دی گئی ہے، اس کو بھی تہذیب جدید نے بڑے زور شور کے ساتھ جہالت کا قانون قرار دیا ہے، مگر تجربے نے ظاہر کر دیا ہے کہ اسلام کا یہ اصول انسانی فطرت کا عین تقاضا ہے، کیونکہ چند زوجیت کے قانون کو ختم کرنا دراصل درجنوں غیر قانونی زوجیت کا دروازہ کھولنا ہے۔

یہاں میں اقوام متحدہ کے ڈیموگرافک سالنامہ ۱۹۵۹ء کا حوالہ دوں گا، اس میں اعداد و شمار کے ذریعہ بتایا گیا ہے کہ جدید دنیا میں جو صورت حال ہے، وہ یہ کہ بچے "اندر سے کم اور باہر سے زیادہ" پیدا ہو رہے ہیں، ڈیموگرافک سالنامہ کے مطابق ان ملکوں میں حرامی بچوں کا تناسب ساٹھ فی صدی ہے، اور بعض ممالک مثلاً پناما میں تو چار میں سے تین بچے پادریوں کی مداخلت یا سول میرج رجسٹری کے بغیر ہی پیدا ہو رہے ہیں، یعنی ۷۵ فی صدی حرامی بچے، لاطینی امریکہ میں اس قسم کے بچوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

متحدہ اقوام کے اس ڈیموگرافک سالنامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم ملکوں میں حرامی بچوں کی پیدائش کا تناسب نفی کے برابر ہے، چنانچہ اس میں بتایا گیا ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ (مصر) میں ناجائز بچوں کا تناسب ایک فی صدی سے بھی کم ہے، جب کہ متحدہ عرب جمہوریہ تمام مسلم ملکوں میں شاید سب سے زیادہ مغربی تہذیب سے متاثر ہوا ہے، مسلم ممالک دورِ جدید کی اس عام وبا سے محفوظ کیوں ہیں، اس کا جواب متحدہ اقوام کا سالنامہ مرتب کرنے والے اڈیٹروں نے یہ دیا ہے کہ چونکہ مسلم ممالک میں چند زوجیت Polygamy کا رواج ہے، اس لئے وہاں ناجائز ولادتوں کا بازار گرم نہیں ہے، چند زوجیت کے اصول نے مسلم ملکوں کو وقتیہ اس طوفان سے بچالیا ہے

(More out than in) مطبوعہ ہندوستان ٹائمس، ۱۲ ستمبر ۱۹۶۰ء

اس طرح تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ سابق خدائی اصول ہی زیادہ صحیح اور مبنی برحقیقت تھا۔

تمدن

اسلام میں قتلِ عمد کی سزا موت ہے الا یہ کہ مقتول کے ورثاء خون بہا لینے پر راضی ہو جائیں، لیکن جدید دورِ ترقی میں جہاں مذہب کی اور تعلیمات کے خلاف ذہن پیدا ہوا اسی طرح سزائے قتل کے بارے میں بھی سخت تنقیدیں کی جانے لگیں، ان حضرات کا خاص استدلال یہ ہے کہ اس قسم کی سزا کا مطلب یہ ہے کہ ایک انسانی جان کے ضائع ہونے کے بعد دوسری انسانی جان کو بھی کھو دیا جائے، پچھلے برسوں میں اکثر ملکوں میں اس رجحان نے بڑی تیزی سے ترقی کی ہے، اور پھانسی کے بجائے قید کی سزائیں تجویز کی جارہی ہیں۔

اسلام نے قاتل کی جو سزا مقرر کی ہے، اس میں دو اہم ترین فائدے ہیں، ایک یہ کہ ایک شخص نے سوسائٹی کے ایک فرد کو قتل کر کے جس برائی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی جڑ آئندہ کے لئے کٹ جائے، مجرم کا یہ عبرتناک انجام دیکھ کر دوسرے لوگ آئندہ اس قسم کی ہمت نہ کر سکیں، اسی کے ساتھ دیت کی جو صورت ہے، اس میں گویا اسلام نے نتائج کا لحاظ کیا ہے، مثلاً اگر کسی کے والدین بوڑھے ہوں اور ان کا اکلوتا بیٹا قتل ہو جائے تو وہ بے سہارا

رہ جاتے ہیں، ایسی حالت میں قاتل کو سزائے موت بھی مل جائے تو انھیں کیا فائدہ، اسلام نے ایسے والدین کی تلافی کے لئے یہ طریقہ رکھا ہے کہ قاتل کے ورثا مقتول کے والدین کو ایک خاص رقم بطور خوں بہا دے کر انھیں راضی کرلیں، اور وہ قتل کو معاف کردیں، اس صورت میں مقتول کے بوڑھے والدین کو مثلاً دس ہزار روپے کی رقم مل جائے گی، اور وہ اس رقم سے اپنی گزر بسر کا انتظام کرسکیں گے ـــــ مخصوص حالات میں ریاست کو بھی یہ حق ہے کہ وہ دیت کی رقم میں اضافہ کردے تاکہ بے سہارا ورثا خسارے میں نہ رہیں۔

یہ ایک نہایت حکیمانہ قانون ہے، اور اس کا تجربہ بتاتا ہے کہ وہ جہاں رائج ہوا قتل کا خاتمہ ہوگیا اس کے برعکس جن ممالک میں سزائے موت کو منسوخ کیا گیا ہے، وہاں جرائم گھٹنے کے بجائے اور بڑھ گئے ہیں، اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہے کہ ایسے ممالک میں قتل کی وارداتوں میں بارہ فی صدی تک اضافہ ہوگیا ہے، چنانچہ اس کی بھی مثالیں موجود ہیں کہ پہلے سزائے موت کو منسوخ کیا گیا، اور اس کے بعد نتائج دیکھ کر دوبارہ اسے بدل دیا گیا، سیلون اسمبلی نے ۱۹۵۶ء میں ایک قانون پاس کیا، جس کے مطابق سیلون کی حدود میں موت کی سزا کو ختم کردیا گیا، اس قانون کے نفاذ کے بعد سیلون میں جرائم تیزی سے بڑھنا شروع ہوگئے، ابتداءً لوگوں کو ہوش نہیں آیا مگر ۲۶ ستمبر ۱۹۵۹ء کو جب ایک شخص نے سیلون کے وزیر اعظم بندرانائک کے مکان میں گھس کر نہایت بے دردی کے ساتھ ان کو قتل کردیا تو سیلون کے قانون سازوں کی آنکھ کھلی، اور وزیر اعظم کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے فوراً بعد سیلون اسمبلی کا ایک ہنگامی اجلاس ہوا، جس میں چار گھنٹے کے بحث و مباحثہ کے بعد یہ اعلان کیا گیا کہ سیلون کی حکومت ۱۹۵۶ء کے قانون کو منسوخ کرکے ملک میں سزائے موت کو دوبارہ جاری کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔

معیشت

مذہب، معاشیات کی جو تنظیم کرتا ہے، اس میں ذرائع پیداوار پر انفرادی ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہے بلکہ اس کا سارا ڈھانچہ بنیادی طور پر انفرادی ملکیت کے اوپر قائم ہے، یہ نظام عرصہ تک

باقی رہا[1]، مگر صنعتی انقلاب کے بعد یورپ میں انفرادی ملکیت کے اصول پر زبردست تنقیدیں شروع ہوئیں، یہاں تک کہ تعلیم یافتہ طبقہ کی عام فضا اس کے خلاف ہو گئی، انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول کے درمیان سو برس تک ایسی فضا رہی گویا انفرادی ملکیت ایک مجرمانہ قانون تھا، جو دورِ وحشت میں انسانوں کے درمیان رائج ہو گیا، اور اب جدید علمی ترقی نے اجتماعی ملکیت کا اصول دریافت کیا ہے، جو معاشیات کی بہتر تنظیم کے لئے اعلیٰ ترین اصول ہے۔

اس کے بعد تاریخ میں پہلی بار اجتماعی ملکیت کے نظام کا تجربہ شروع ہوا، زمین کے ایک بڑے حصے میں اس کو نافذ کیا گیا، اس کے حق میں بڑے بڑے دعوے کئے گئے، بڑی بڑی امیدیں باندھی گئیں، مگر طویل تجربہ سے ثابت ہو گیا کہ اجتماعی ملکیت کا نظام نہ صرف یہ کہ غیر فطری ہونے کی وجہ سے اپنے قیام کے لئے تشدد پیدا کرتا ہے، نہ صرف یہ کہ وہ انسان کی ہمہ جہتی ترقی میں مانع ہے، نہ صرف یہ کہ سرمایہ داری سے بھی زیادہ ایک مرکوز اور جابرانہ نظام کا موجب ہے بلکہ خود وہ زرعی اور صنعتی پیداوار بھی اس میں ملکیتی نظام کے مقابلے میں کم حاصل ہوتی ہے، جس کے لئے آزادی اور ہمہ جہتی ترقی کی قربانی دی گئی تھی۔

یہاں میں روس کی مثال دوں گا، روس کی تمام زمینیں اس وقت سرکاری ملکیت میں تبدیل کی جا چکی ہیں، اور پورے ملک میں "اجتماعی انتظام" کے تحت کاشت کی جاتی ہے، ساری زمینیں سرکاری اور پنچایتی فارم کی صورت میں ہیں، نہ کہ نجی ملکیت کی صورت میں، البتہ ۱۹۳۵ء کے فیصلہ کے مطابق ہر کسان کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنے رہائشی مکان سے متصل اپنے ذاتی استعمال کے لئے ایک تہائی یا نصف ایکڑ اور بعض مخصوص صورتوں میں دو ایکڑ تک زمین پر قبضہ رکھ سکتا ہے، اسی طرح اسے یہ بھی حق ہے کہ اپنے مکان میں محدود تعداد میں گائے، بکری، بھیڑ اور مرغی وغیرہ پالے، ۱۹۶۱ء کے اعداد و شمار کے مطابق روس میں کل زیر کاشت رقبہ ۴۸۰ ملین ایکڑ

---

[1] انفرادی ملکیت کا نظام جو ساری دنیا میں جاری ہوا وہ دراصل مذہب ہی کے اثر کا نتیجہ تھا، اور اسی لئے مارکس اور اس کے متبعین نے مذہب کی شدید مخالفت کی کیونکہ اس کے بغیر وہ انفرادی ملکیت کی اہمیت کو ذہنوں سے نکال نہیں سکتے تھے۔

(Hectares) تھا، جس میں نجی رقبہ کی مجموعی مقدار چھ ملین ہیکٹیر تھی یعنی کل زیر کاشت زمین کا صرف تین فیصدی حصہ، مگر ۱۹۶۱ء میں آلو کی پیداوار کا جو تناسب تھا، وہ حسب ذیل ہے۔۔

	زیرکاشت زمین	پیداوار
اجتماعی رقبہ	۴۳,۵۲,۰۰۰	۳,۰۸,۰۰,۰۰۰ ٹن
نجی رقبہ	۴۵,۲۶,۰۰۰	۵,۳۵,۰۰,۰۰۰ ٹن

اس طرح نجی رقبہ پر پیدا ہونے والے آلو کی مقدار گیارہ ٹن فی ہیکٹیر تھی، جبکہ سرکاری فارموں میں یہ مقدار صرف سات ٹن فی ہیکٹیر تھی، حالانکہ سرکاری فارموں کو جدید زرعی مشینیں، موزوں زمین اور معدنی کھاد وغیرہ کی وہ سہولتیں حاصل تھیں جن سے نجی رقبے قدرتی طور پر محروم تھے، اسی قسم کا تناسب دوسرے اجناس کی پیداوار میں بھی پایا جاتا ہے۔

مویشیوں کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب ہے، چارہ کی کمی اور ناقص دیکھ بھال کی وجہ سے سرکاری فارموں میں کثرت سے جانور مر جاتے ہیں چنانچہ صرف ایک ریاست میں ۱۹۶۲ء کے گیارہ مہینوں میں مجموعی طور پر تقریباً ایک لاکھ ۰۰ ہزار مویشی مر گئے، اس کے مقابلے میں ہر قسم کی دشواریوں کے باوجود نجی طور پر پالے ہوئے مویشیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے، اور باعتبار تناسب وہ سرکاری جانوروں سے زیادہ مفید ثابت ہو رہے ہیں، اور زیادہ پیداوار دے رہے ہیں، چنانچہ سرکاری فارم جو کل تعداد کا ۰ ۷ فی صدی مرغیوں اور مویشیوں کے مالک ہیں، انھوں نے نجی ذرائع کے مقابلے میں صرف دس فیصدی زیادہ گوشت فراہم کیا اور انڈے میں تو نجی پیداوار نے انھیں بہت پیچھے چھوڑ دیا، ۱۹۶۱ء کے اعداد و شمار ملاحظہ ہوں۔

	اجتماعی رقبہ	نجی رقبہ
گوشت	۴۸,۰۰,۰۰۰ ٹن	۳۹,۰۰,۰۰۰ ٹن
دودھ	۳,۴۰,۰۰,۰۰۰ ٹن	۲,۸۵,۰۰,۰۰۰ ٹن
انڈا	۶۳۰۰ ملین	۲۳,۰۰۰ ملین
اون	۲,۸۷,۰۰۰ ٹن	۷۹,۰۰۰ ٹن

حتیٰ کہ یہ محدود نجی ذرائع خود حکومتی مرکزوں کو غذائی اشیا سپلائی کرتے ہیں، چنانچہ ۱۹۶۲ء میں صرف ایک ریاست میں حکومت نے اپنے دفاتر کا ۲۶ فیصدی آلو اور ۳۴ فیصدی انڈا نجی فارموں سے حاصل کیا ہے، اور اسی طرح دوسری چیزیں۔

Bulletin, Germany, November 1963

اس اجتماعی ملکیت کا آخری انجام یہ ہے کہ روس جو زار کے زمانے میں، جبکہ وہاں نجی ملکیت کا نظام رائج تھا، اناج کے معاملے میں دنیا کے چند بڑے برآمدی ملکوں میں سے تھا، اس نے ۱۹۶۳ء میں کناڈا، آسٹریلیا اور امریکہ سے پندرہ ملین ٹن گیہوں خریدا ہے، اور یہ صورتِ حال مسلسل جاری ہے، چنانچہ ۱۹۶۱-۶۲ء میں اس نے امریکہ سے بارہ لاکھ پچاس ہزار ٹن غلہ خریدا ہے، اسی طرح بعد کے سالوں میں بھی یہی حال دوسرے اشتراکی ملک چین کا بھی ہے۔

Bulletin Oct. 1963

اس تجربے سے معلوم ہوا کہ مذہب کا قانون جس ذہن سے نکلا ہے، وہ انسانی فطرت کو زیادہ جاننے والا ہے، اور اس کے مسائل کو زیادہ گہرائی کے ساتھ سمجھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ سب کچھ جو تمدن کی تعمیر کے لئے ہمیں درکار ہے، اس کا واحد اور حقیقی جواب صرف مذہب کے پاس ہے، مذہب ہمیں حقیقی قانون ساز کی طرف رہنمائی کرتا ہے، وہ قانون کی موزوں ترین اساس فراہم کرتا ہے، وہ زندگی کے ہر معاملے میں وہ صحیح ترین بنیاد دیتا ہے جس کی روشنی میں ہم زندگی کا مکمل نقشہ بنا سکیں، وہ حاکموں اور محکوموں کے درمیان قانونی مساوات پیدا کرنے کی واحد صورت ہے، وہ قانون کے لئے وہ نفسیاتی بنیاد فراہم کرتا ہے جس کی عدم موجودگی میں قانون عملاً بے کار ہو کر رہ جاتا ہے، وہ سوسائٹی کے اندر وہ موافق فضا پیدا کرتا ہے جو کسی قانون کے نفاذ کے لئے ضروری ہے، اس طرح مذہب ہمیں وہ سب کچھ دیتا ہے جس کی ہمیں اپنے تمدن کی تعمیر کے لئے ضرورت ہے، جبکہ لامذہبیت ان میں سے کچھ بھی نہیں دیتی اور نہ حقیقتاً دے سکتی ہے۔

جس زندگی کی ہمیں تلاش ہے

فریڈرش انگلس نے کہا ہے —— "آدمی کو سب سے پہلے تن ڈھانکنے کو کپڑا اور پیٹ بھرنے کو روٹی چاہئے، اس کے بعد ہی وہ فلسفہ و سیاست کے مسائل پر غور کر سکتا ہے"۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان سب سے پہلے جس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے، وہ یہ سوال ہے کہ "میں کیا ہوں، یہ کائنات کیا ہے، میری زندگی کیسے شروع ہوئی اور کہاں جا کر ختم ہوگی" یہ انسانی فطرت کے بنیادی سوالات ہیں، آدمی ایک ایسی دنیا میں آنکھ کھولتا ہے، جہاں سب کچھ ہے مگر یہی ایک چیز نہیں، سورج اس کو روشنی اور حرارت پہونچاتا ہے مگر وہ نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے اور کیوں انسان کی خدمت میں لگا ہوا ہے، ہوا اس کو زندگی بخشتی ہے، مگر انسان کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اس کو پکڑ کر پوچھ سکے کہ تم کون ہو اور کیوں ایسا کر رہی ہو، وہ اپنے وجود کو دیکھتا ہے، اور نہیں جانتا کہ میں کیا ہوں اور کس لئے اس دنیا میں آگیا ہوں، ان سوالات کا جواب متعین کرنے سے انسان کا ذہن قاصر ہے، مگر انسان بہرحال ان کو معلوم کرنا چاہتا ہے، یہ سوالات خواہ لفظوں کی شکل میں متعین ہو کر ہر شخص کی زبان پر نہ آئیں مگر وہ انسان کی روح کو بے چین رکھتے ہیں، اور کبھی کبھی اس شدت سے ابھرتے ہیں، کہ آدمی کو پاگل بنا دیتے ہیں۔

انگلس کو دنیا ایک ملحد انسان کی حیثیت سے جانتی ہے، مگر اس کا الحاد اس کے غلط ماحول کا رد عمل تھا جو بہت بعد کو اس کی زندگی میں ظاہر ہوا، اس کی ابتدائی زندگی مذہبی ماحول میں گزری مگر جب وہ بڑا ہوا اور نظر میں گہرائی پیدا ہوئی تو رسمی مذہب سے بے اطمینانی پیدا ہو گئی، اپنے اس دور کا حال وہ ایک دوست کے خط میں اس طرح لکھتا ہے:

"میں ہر روز دعا کرتا ہوں اور تمام دن یہی دعا کرتا رہتا ہوں کہ مجھ پر حقیقت آشکارا ہو جائے جب سے میرے دل میں شکوک پیدا ہوئے ہیں یہی دعا کرنا میرا مشغلہ ہے، میں تمہارے عقیدے کو قبول نہیں کر سکتا، میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور میرا دل آنسوؤں سے امڈا چلا آرہا ہے، میری آنکھیں رو رہی ہیں لیکن مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ میں راندۂ درگاہ نہیں ہوں، مجھے امید ہے کہ میں خدا تک پہنچ جاؤں گا جس کے دیدار کا میں دل و جان سے متمنی ہوں، اور مجھے اپنی جان کی قسم! یہ میری جستجو اور عشق کیا ہے، یہ روح القدس کی جھلک ہے، اگر انجیل مقدس دس ہزار مرتبہ بھی اس کی تردید کرے تو میں نہیں مان سکتا۔"

یہ وہی حقیقت کی تلاش کا فطری جذبہ ہے جو نوجوان انگلس میں ابھرا تھا، مگر اس کو تسکین نہ مل سکی اور مروجہ مسیحی مذہب سے غیر مطمئن ہو کر وہ معاشی اور سیاسی فلسفوں میں گم ہو گیا۔

اس طلب کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں ایک خالق اور مالک کا شعور پیدائشی طور پر پیوست ہے، وہ اس کے لاشعور کا ایک لازمی جزو ہے، "خدا میرا خالق ہے اور میں اس کا بندہ ہوں" یہ ایک خاموش عہد ہے جو ہر شخص اول روز سے اپنے ساتھ لے کر اس دنیا میں آتا ہے، ایک پیدا کرنے والے آقا و محسن کا تصور غیر محسوس طور پر اس کی رگوں میں دوڑتا رہتا ہے، اس کے بغیر وہ اپنے اندر عظیم خلا محسوس کرتا ہے، اس کی روح اندر سے زور کرتی ہے کہ جس آقا کو اس نے نہیں دیکھا، اسے پالے، اس سے لپٹ جائے اور اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دے۔

خدا کی معرفت ملنا گویا اس جذبے کے صحیح مرجع کو پالینا ہے، اور جو لوگ خدا کو نہیں پاتے ان کے جذبات کسی دوسری مصنوعی چیز کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، ہر شخص اپنے اندر یہ خواہش رکھنے پر مجبور ہے کہ کوئی ہو جس کے آگے وہ اپنے بہترین جذبات کو نذر کر دے، ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ہندوستان کی سرکاری عمارتوں سے یونین جیک اتار کر ملک کا قومی جھنڈا لہرایا گیا تو یہ منظر دیکھ کر ان قوم پرستوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے جو اپنے ملک کو آزاد دیکھنے کے لئے تڑپ رہے تھے، یہ آنسو دراصل آزادی کی دیوی کے ساتھ ان کے تعلق کا اظہار تھا ــــ یہ اپنے معبود کو پالینے کی خوشی تھی جس کے لئے انھوں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ صرف کر دیا تھا، اسی طرح ایک لیڈر جب قوم کے

باپ" کی قبر پر جا کر پھول چڑھاتا ہے اور اس کے آگے سر جھکا کر کھڑا ہو جاتا ہے تو وہ ٹھیک اسی عمل کو دہراتا ہے جو ایک مذہبی آدمی اپنے معبود کے لئے رکوع اور سجدے کے نام سے کرتا ہے ایک کمیونسٹ جب لینن کے مجسمے کے پاس سے گزرتے ہوئے اپنی ہیٹ اتارتا ہے اور اس کے قدموں کی رفتار سست پڑ جاتی ہے تو اس وقت وہ اپنے معبود کی خدمت میں اپنے عقیدت کے جذبات نذر کر رہا ہوتا ہے، اسی طرح ہر شخص مجبور ہے کہ کسی نہ کسی چیز کو اپنا معبود بنائے اور اپنے جذبات کی قربانی اس کے آگے پیش کرے۔

مگر خدا کے سوا جن جن صورتوں میں آدمی اپنا یہ نذرانہ پیش کرتا ہے وہ سب شرک کی صورتیں ہیں اور "اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ" (شرک سب سے بڑا ظلم ہے) ظلم کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کی اصل جگہ کے بجائے دوسری جگہ رکھ دینا مثلاً ڈبہ کے ڈھکن سے آپ بچے کی ٹوپی کا کام لینا چاہیں تو یہ ظلم ہوگا، گویا آدمی جب اپنے نفسیاتی خلا کو پر کرنے کے لئے خدا کو چھوڑ کر کسی اور طرف لپکتا ہے جب وہ خدا کے سوا کسی اور کو اپنی زندگی کا سہارا بناتا ہے تو وہ اپنے اصل مقام کو چھوڑ دیتا ہے وہ ایک صحیح جذبے کا غلط استعمال کرتا ہے۔

یہ جذبہ چونکہ ایک فطری جذبہ ہے، اس لئے ابتداً وہ ہمیشہ فطری شکل میں ابھرتا ہے، اس کا پہلا رخ اپنے اصلی معبود کی طرف ہوتا ہے، مگر حالات اور ماحول کی خرابیاں اس کو غلط سمت میں موڑ دیتی ہیں اور کچھ دنوں کے بعد جب آدمی ایک مخصوص زندگی سے مانوس ہو جاتا ہے تو اس میں اس کو لذت ملنے لگتی ہے برٹرینڈ رسل اپنے بچپن میں ایک کٹر مذہبی آدمی تھا، وہ باقاعدہ عبادت کرتا تھا — اسی زمانے میں ایک روز اس کے دادا جان نے پوچھا — "تمہاری پسندیدہ دعا کون سی ہے" چھوٹے رسل نے جواب دیا "میں زندگی سے تنگ آ گیا ہوں اور اپنے گناہوں کے بوجھ سے دبا ہوا ہوں" اس زمانے میں خدا برٹرینڈ رسل کا معبود تھا لیکن جب رسل تیرہ برس کی عمر کو پہنچا تو اس کی عبادت چھوٹ گئی اور مذہبی روایات اور پرانی قدروں سے باغیانہ ماحول کے اندر رہنے کی وجہ سے خود اس کے اندر بھی ان چیزوں سے بغاوت کے رجحانات ابھرنے لگے اور اب برٹرینڈ رسل ایک ملحد انسان ہے جس کی محبوب ترین چیزیں ریاضی اور فلسفہ ہیں، ۱۹۵۹ء کا واقعہ ہے بی بی سی لندن پر ایک بات چیت پروگرام

مس فری مین نے رسل سے پوچھا —— "کیا آپ نے مجموعی طور پر ریاضی اور فلسفے کے شوق کو مذہبی جذبات کا نعم البدل پایا ہے؟" رسل نے جواب دیا "جی ہاں، یقیناً میں چالیس برس کی عمر تک اس اطمینان سے ہم کنار ہو گیا تھا، جس کے متعلق افلاطون نے کہا ہے کہ آپ ریاضی سے حاصل کر سکتے ہیں —— یہ ایک ابدی دنیا تھی، وقت کی قید سے آزاد دنیا، مجھے یہاں مذہب سے ملتا جلتا ایک سکون نصیب ہو گیا۔"

برطانیہ کے اس عظیم مفکر نے خدا کو اپنا معبود بنانے سے انکار کر دیا، مگر معبود کی ضرورت سے پھر بھی وہ بے نیاز نہ رہ سکا، اور جس مقام پر پہلے اس نے خدا کو بٹھا رکھا تھا، وہاں ریاضی اور فلسفے کو بٹھانا پڑا، اور صرف یہی نہیں بلکہ ریاضی اور فلسفے کے لئے وہ صفات بھی تسلیم کرنی پڑیں جو صرف خدا ہی کی صفت ہو سکتی ہے —— ابدیت اور وقت کی قید سے آزادی! کیونکہ اس کے بغیر اسے مذہب سے ملتا جلتا وہ سکون نہیں مل سکتا تھا جو دراصل اس کی فطرت تلاش کر رہی تھی۔

"نہرو رکوع میں" —— اگر یہ خبر کسی دن اخبار میں چھپے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا کہ یہ واقعہ ہے لیکن ہندوستان ٹائمس (دہلی) کی ۳ / اکتوبر ۱۹۶۳ء کی اشاعت کے آخری صفحہ پر شائع شدہ تصویر اس کی تصدیق کر رہی ہے، اس تصویر میں نظر آرہا ہے کہ ہندوستان کے سابق وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو دو زانو ہو کر اور ہاتھ جوڑ کر رکوع کی مانند جھکے ہوئے ہیں، یہ گاندھی جینتی کے موقع کی تصویر ہے، اور نہرو راج گھاٹ میں گاندھی سمادھی پر قوم کے باپو کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں۔

اس قسم کے واقعات ہر سال اور ہر روز ساری دنیا میں ہوتے ہیں، لاکھوں ایسے لوگ جو خدا کو نہیں مانتے اور پرستش کو بے معنی چیز سمجھتے ہیں —— وہ اپنے خود ساختہ بتوں کے آگے جھک کر اپنے اندرونی جذبۂ عبودیت کو تسکین دیتے ہیں، یہ حقیقت ہے کہ "الٰہ" انسان کی ایک فطری ضرورت ہے، اور یہی اس کا ثبوت ہے کہ وہ حقیقی ہے، انسان اگر خدا کے سامنے نہ جھکے تو اس کو دوسرے الٰہوں کے سامنے جھکنا پڑے گا، کیونکہ "الٰہ" کے بغیر اس کی فطرت اپنے خلا کو پر نہیں کر سکتی۔

مگر بات صرف اتنی نہیں ہے، اس سے آگے بڑھ کر میں کہتا ہوں کہ جو لوگ خدا کے سوا کسی اور کو اپنا معبود بناتے ہیں، وہ ٹھیک اسی طرح حقیقی سکون سے محروم رہتے ہیں، جیسے کوئی بے بچہ کی ماں پلاسٹک کی گڑیا خرید کر بغل میں دبائے اور اس سے تسکین حاصل کرنا چاہے، ایک ملحد انسان خواہ وہ کتنا ہی کامیاب کیوں نہ ہو، اس کی زندگی

میں ایسے لمحات آتے ہیں، جب وہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ حقیقت اس کے سوا کچھ اور ہے جو میں نے پائی ہے۔

آزادی سے بارہ سال پہلے ۱۹۳۵ء میں جب پنڈت جواہر لال نہرو نے جیل خانے میں اپنی آپ بیتی مکمل کی تو اس کے آخر میں انھوں نے لکھا:۔

"میں محسوس کرتا ہوں کہ میری زندگی کا ایک باب ختم ہو گیا اور اب اس کا دوسرا باب شروع ہو گا۔ اس میں کیا ہو گا، اس کے متعلق میں کوئی قیاس نہیں کر سکتا، کتاب زندگی کے اگلے ورق سر بمہر ہیں"

Nehru—Autobiography, London 1953, p. 597

نہرو کی زندگی کے اگلے اوراق کھلے تو معلوم ہوا کہ وہ دنیا کے تیسرے سب سے بڑے ملک کے وزیر اعظم ہیں، اور دنیا کی آبادی کے چھٹے حصہ پر بلا شرکت حکومت کر رہے ہیں، مگر اس بازیافت نے نہرو کو مطمئن نہیں کیا اور اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں بھی وہ محسوس کرتے رہے کہ کتاب زندگی کے مزید کچھ اوراق ہیں جو ابھی تک بند ہیں، اور وہی سوال آخر عمر میں بھی ان کے ذہن میں گھومتا رہا جس کو لے کر ہر انسان پہلے روز پیدا ہوتا ہے۔ جنوری ۱۹۶۴ء کے پہلے ہفتہ میں مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس نئی دہلی میں ہوئی جس میں ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے بارہ سو ڈیلی گیٹ شریک ہوئے، پنڈت نہرو نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

"میں ایک سیاست داں ہوں اور مجھے سوچنے کے لئے وقت کم ملتا ہے پھر بھی بعض اوقات میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ آخر یہ دنیا کیا ہے، کس لئے ہے، ہم کیا ہیں اور ہم کیا کر رہے ہیں، میرا یقین ہے کہ کچھ طاقتیں ہیں جو ہماری تقدیر بناتی ہیں"

(*National Herald*, Jan. 6, 1964)

یہ ایک عدم اطمینان ہے، جو ان تمام لوگوں کی روحوں پر گہرے کہر کی طرح چھایا رہتا ہے جنھوں نے خدا کو اپنا الٰہ اور معبود بنانے سے انکار کیا، دنیا کی مصروفیتوں اور وقتی دلچسپیوں میں عارضی طور پر کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اطمینان سے ہم کنار ہیں، مگر جہاں یہ مصنوعی ماحول ختم ہوا، حقیقت اندر سے زور کرنا شروع کر دیتی ہے اور انھیں یاد دلاتی ہے کہ وہ سچے اطمینان سے محروم ہیں۔

خدا سے محروم قلوب کا یہ حال صرف ایک دنیوی بے اطمینانی کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ وہ اس سے بہت زیادہ اہم ہے، یہ چند روزہ مسئلہ نہیں بلکہ دائمی مسئلہ ہے، یہ دراصل اس تاریک اور بے سہارا زندگی کے آثار ہیں جس کے کنارے وہ کھڑا ہوا ہے، یہ اس ہولناک زندگی کی ابتدائی گھٹن ہے جس میں ایسے ہر آدمی کو موت کے بعد داخل ہونا ہے، اور اس خطرے کا ایک پیشگی الارم ہے، جس میں اس کی روح کو بالآخر مبتلا ہونا ہے، مختصر یہ کہ وہ اس جہنم کا دھواں ہے جو ہر کافر و مشرک کے لئے تیار کی گئی ہے گھر میں آگ لگ جائے تو اس کا دھواں سوتے ہوئے آدمی کے دماغ میں گھس کر اس کو آنے والے خطرے سے باخبر کرتا ہے، اگر وہ دھوئیں کی گھٹن سے جگ گیا تو اپنے آپ کو بچالے جائے گا، لیکن جب شعلے قریب آجائیں تو وہ انتباہ کا وقت نہیں ہوتا، بلکہ وہ ہلاکت کا فیصلہ ہوتا ہے، جو اس کو چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تمہاری بے حسی اور بے خبری نے تمہارے لئے مقدر کر دیا ہے کہ تم آگ میں جلو۔

کیا کوئی ہے جو وقت سے پہلے بیدار ہو جائے، کیونکہ بیداری وہی ہے، جو وقت سے پہلے ہو، وقت پر بیدار ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔

۲۔ میک گل یونیورسٹی کے پروفیسر مائیکل بریچر (Michael Brecher) نے پنڈت جواہر لال نہرو کی سیاسی سوانح حیات لکھی ہے، اس سلسلے میں مصنف نے پنڈت نہرو سے ملاقات بھی کی تھی، نئی دہلی کی ایک ملاقات میں ۱۳ رجون ۱۹۵۶ء کو انھوں نے پنڈت نہرو سے سوال کیا:۔

"آپ مختصر طور پر مجھے بتائیں کہ آپ کے نزدیک اچھے سماج کے لئے کیا چیزیں ضروری ہیں، اور آپ کا بنیادی فلسفۂ زندگی کیا ہے؟"

ہندوستان کے سابق وزیر اعظم نے جواب دیا:۔

"میں کچھ معیاروں کا قائل ہوں، آپ ان کو اخلاقی معیار Moral Standards کہہ لیجئے، یہ معیار ہر فرد اور سماجی گروہ کے لئے ضروری ہیں، اگر وہ باقی نہ رہیں تو تمام مادی ترقی کے باوجود آپ کسی

مفید نتیجے تک نہیں پہنچ سکتے، ان معیاروں کو کیسے قائم رکھا جائے، یہ مجھے نہیں معلوم۔ ایک تو مذہبی نقطۂ نظر ہے لیکن یہ اپنے تمام رسوم اور طریقوں کے ساتھ مجھے تنگ نظر آتا ہے، میں اخلاقی اور روحانی قدروں کو مذہب سے علیحدہ رکھ کر بڑی اہمیت دیتا ہوں، لیکن میں نہیں جانتا کہ ان کو ماڈرن زندگی میں کس طرح قائم رکھا جا سکتا ہے یہ ایک مسئلہ ہے۔"

Nehru : A Political Biography, London, 1959, p. 607-8

یہ سوال و جواب جدید انسان کے اس دوسرے خلا کو بتاتا ہے، جس میں آج وہ شدت سے گرفتار ہے، افراد کو دیانت و اخلاق کے ایک خاص معیار پر باقی رکھنا ہر سماجی گروہ کی ایک ناگزیر ضرورت ہے اس کے بغیر تمدن کا نظام صحیح طور پر برقرار نہیں رہ سکتا، مگر خدا کو چھوڑنے کے بعد انسان کو نہیں معلوم کہ وہ اس ضرورت کو کیسے پورا کرے، سیکڑوں سال کے تجربے کے بعد وہ ابھی بدستور تلاش کی منزل میں ہے، پبلک اور حکام کے درمیان عمدہ تعلقات پیدا کرنے کے لئے خوش اخلاقی کا ہفتہ (Courtesy Week) منایا جاتا ہے، مگر اس کے بعد بھی جب سرکاری ملازموں کی افسرانہ ذہنیت ختم نہیں ہوتی تو معلوم ہوتا ہے کہ اس مقصد کے لئے "اخلاق" کا حوالہ دینا کافی نہیں ہے، بے ٹکٹ مسافروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو روکنے کے لئے تمام اسٹیشنوں پر بڑے بڑے پوسٹر لگائے جاتے ہیں: "بے ٹکٹ سفر کرنا سماجی گناہ ہے Ticketless travel is a social evil" مگر جب اس کے باوجود بے ٹکٹ سفر ختم نہیں ہوتا تو یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ "سماجی گناہ" کا لفظ وہ احساس پیدا نہیں کر سکتا جو نظم و ضبط کی تعمیل کے لئے محرک بن سکے، پریس کے ذریعہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ جرم کا انجام اچھا نہیں ہوتا (Crime does not pay) مگر جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار بتاتی ہے کہ دنیوی نقصان کے اندیشہ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ آدمی کو جرم سے باز رکھے، تمام دفتروں کی دیواریں مختلف زبانوں کے ان الفاظ سے رنگین کر دی جاتی ہیں — "رشوت لینا اور رشوت دینا پاپ ہے" مگر جب ایک شخص دیکھتا ہے کہ ہر محکمے میں عین انھیں الفاظ کے نیچے رشوت کا کاروبار پورے زور شور سے جاری ہے تو وہ یہ اعتراف

کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس قسم کے سرکاری پروپیگنڈے رشوت کو روکنے میں کسی درجہ میں بھی مفید نہیں ہیں' ریل کے تمام ڈبوں میں اس مضمون کے کتبے لگائے جاتے ہیں ـــــ "ریلوے قوم کی ملکیت ہے' اس کا نقصان پوری قوم کا نقصان ہے" مگر اس کے باوجود جب لوگ کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالتے ہیں' اور بجلی کے بلب غائب کر دیتے ہیں' تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ "قوم" کے مفاد میں اتنا زور نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے ایک شخص اپنے ذاتی مفاد کو قربان کر دے "اجتماعی ذرائع کو ذاتی مفاد کے لئے استعمال کرنا ملک و قوم سے غداری ہے" ایک طرف لیڈروں اور حکمرانوں کی زبان سے یہ اعلان ہو رہا ہے، دوسری طرف بڑے بڑے قومی منصوبے اس لئے ناکام ہو رہے ہیں کہ سرمایہ کا بڑا حصہ اصل منصوبہ پر لگنے کے بجائے متعلقہ کارکنوں کی تحویل میں چلا جاتا ہے' اسی طرح ساری قومی زندگی انتہائی کوشش کے باوجود ان معیاروں سے محروم ہو گئی ہے جو قومی تعمیر کے لئے ضروری ہیں' اور ان معیاروں کو پیدا کرنے کے لئے جتنے ذرائع استعمال کئے گئے' وہ سب کے سب قطعی ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

یہ علامتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ بے خدا تہذیب نے انسانیت کی گاڑی کو دلدل میں لا کر ڈال دیا ہے' اس کو اس پٹری سے محروم کر دیا ہے، جس کے اوپر چل کر وہ اپنا سفر بحسن و خوبی طے کر سکتی ہے' زندگی کی کشتی بے لنگر اور بغیر بادبان ہو گئی ہے، اس کا واحد حل یہ ہے کہ انسان خدا کی طرف پلٹے، وہ زندگی کے لئے مذہب کی اہمیت کو تسلیم کرے' یہی وہ تنہا بنیاد ہے، جس پر زندگی کی بہتر تعمیر ممکن ہے، اس کے سوا کسی بھی دوسری بنیاد پر زندگی کی تعمیر نہیں کی جا سکتی۔

ہندوستان میں امریکہ کے سابق سفیر مسٹر چیسٹر باولز (Chester Bowles) لکھتے ہیں :-

"زیر ترقی ممالک صنعتی ترقی حاصل کرنے کے سلسلے میں دو طرح کے مسائل سے دوچار ہیں اور دونوں نہایت پیچیدہ ہیں' ایک یہ کہ سرمایہ خام اشیاء اور فنی مہارت جو انھیں حاصل ہیں' ان کو کس طرح زیادہ بہتر طور پر استعمال کریں......

دوسرا پیچیدہ مسئلہ وہ ہے جس کا تعلق عوام اور ادارہ سے ہے، صنعت کو تیزی سے آگے بڑھانے کے ساتھ ہمیں یہ یقین بھی حاصل کرنا ہے کہ وہ جتنی خرابیوں کو دور کرے اس سے زیادہ خرابیاں پیدا نہ کرے' مہاتما گاندھی کے الفاظ میں

"سائنسی معلومات اور دریافتیں محض حرص کو بڑھانے کا اوزار ثابت ہو سکتی ہیں، اصل قابل لحاظ چیز انسان ہے"۔

The Making of a Society, Delhi 1963, p. 68-69

باؤلز کے الفاظ میں عوام گویا وہ ماحول ہیں جس کے اندر ترقیاتی پروگرام جاری ہوتے ہیں، ترقی کے ضروری سامان —— سرمایہ اور فنی مہارت وغیرہ تمدنی اور سیاسی خلا میں کارگر ثابت نہیں ہو سکتے۔ (ص ۳۱)

یہ خلا کیسے پر ہو اور وہ ماحول کیسے بنے جس میں عوام اور سرکاری کارکن دیانتداری اور اتحاد کے ساتھ ترقیاتی کاموں میں اپنے آپ کو صرف کریں، اس سوال کا کوئی جواب جدید مفکرین کے پاس نہیں ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ بے خدا تہذیب کے ماحول میں نہیں ہو سکتا، بے خدا تہذیب کے اندر ہر ترقیاتی اسکیم ایک زبردست تضاد کا شکار ہوتی ہے، اور وہ یہ کہ اس کا شخصی نظریہ اس کے سماجی تصور سے ٹکراتا ہے، اس کا اجتماعی پروگرام یہ ہے کہ ایک پرامن اور خوشحال سماج کی تعمیر کی جائے، مگر اسی کے ساتھ اس کے مفکرین جب یہ کہتے ہیں کہ "انسان کا مقصد مادی خوشی حاصل کرنا ہے" تو وہ اپنی پہلی بات کی تردید کر دیتے ہیں، وہ پورے سماج کو جیسا دیکھنا چاہتے ہیں، سماج کے افراد کو اس کے خلاف بنا رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس طرح کی کسی اسکیم کو اب تک اپنے مقصد میں حقیقی کامیابی حاصل نہیں ہوئی، تمام مادی فلسفے زندگی کا بہتر نظام بنانے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

مادی خوشی کو زندگی کا مقصد بنانے کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی خواہش پوری کرنا چاہے، لیکن اس محدود دنیا میں یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر شخص دوسرے کو متاثر کئے بغیر یکساں طور پر اپنی اپنی خواہش پوری کر سکے، نتیجہ یہ ہے کہ ایک آدمی جب اپنی تمام خواہشیں پوری کرنا چاہتا ہے تو وہ دوسروں کے لئے مصیبت بن جاتا ہے، فرد کی خوشی، سماج کی خوشی کو درہم برہم کر دیتی ہے، ایک محدود آمدنی والا شخص جب دیکھتا ہے کہ اس کی اپنی آمدنی اس کی خواہشوں کی تکمیل کے لئے کافی نہیں ہو رہی ہے تو وہ حق ماری، بددیانتی، چوری، رشوت اور غبن کے ذریعہ اپنی آمدنی کی کمی کو پورا کرتا ہے، مگر اس طرح جب وہ اپنی خواہش پوری کر لیتا ہے تو وہ سماج کو اسی محتاجی میں مبتلا کر دیتا ہے، جس میں وہ خود پہلے مبتلا تھا۔

جدید دنیا ایک عجیب و غریب قسم کی نہایت خطرناک مصیبت میں مبتلا ہے، جس کا تاریخ میں کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا، یہ جرم کم سنی (Juvenile Delinquency) ہے، جو جدید زندگی کا ایک لازمہ بن چکا ہے، یہ کمسن مجرمین کہاں سے پیدا ہوتے ہیں، ان کی پیدائش کا سرچشمہ وہی مادی خوشی کو پورا کرنا ہے، ایک شادی شدہ جوڑا کچھ دنوں ساتھ رہنے کے بعد ایک دوسرے سے اکتا جاتے ہیں، اور اپنی جنسی خوشی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ نیا جسم اور نیا چہرہ تلاش کریں، اس وقت وہ طلاق لے کر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے ہیں، اس علیحدگی کی قیمت سماج کو چند ایسے بچوں کی شکل میں ملتی ہے، جو اپنے ماں باپ کی موجودگی میں "یتیم" ہو گئے ہیں، یہ بچے والدین سے چھوٹنے کے بعد ماحول کے اندر اپنی کوئی جگہ نہیں پاتے، ایک طرف وہ بالکل آزاد ہوتے ہیں، اور دوسری طرف ماحول سے بیزار، یہ صورت حال بہت جلد انھیں جرائم تک پہنچا دیتی ہے، سر الفرڈ ڈیننگ Alfred Denning نے بہت صحیح لکھا ہے کہ "اکثر کمسن اور نابالغ مجرمین اجڑے ہوئے گھرانوں (Broken Homes) سے نمودار ہوتے ہیں"

(*The Changing Law*, p. 111)

اسی طرح موجودہ زندگی میں تمام خرابیوں کی جڑ صرف یہ واقعہ ہے کہ جدید دنیا کا انفرادی فلسفہ اور اس کے اجتماعی مقاصد ایک دوسرے سے متضاد ہیں، وہ تمام واردات جن کو ہم ناپسند کرتے ہیں، اور ان کو جرم، برائی اور بدعنوانی کہتے ہیں، وہ دراصل کسی شخص یا پارٹی یا قوم کی اپنی مادی خوشی حاصل کرنے کی کوشش ہی ہوتی ہے، اور اسی کوشش کا سماجی انجام قتل، بدکاری، لڑائی، اغوا، جعل سازی، ڈاکہ، لوٹ کھسوٹ، جنگ اور اسی طرح کی دوسری بے شمار صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

یہ تضاد بتاتا ہے کہ زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا کہ دنیا کی مادی چیزوں کے بجائے آخرت میں خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کو مقصد بنایا جائے، یہی وہ مقصد ہے جو فرد اور سماج کو باہمی تضاد سے بچا کر متوافق ترقی کی راہ پر گامزن کرتا ہے ـــــ نظریۂ آخرت کی یہ خصوصیت جہاں یہ ثابت کرتی ہے کہ وہی وہ واحد بنیاد ہے، جو ترقیاتی اسکیموں کو صحیح طور پر کامیاب کر سکتی ہے، اسی کے ساتھ وہ یہ بھی

ثابت کرتی ہے کہ وہی حقیقی مقصد ہے، کیونکہ غیر حقیقی چیز زندگی کے لئے اتنی اہم اور اس سے اتنی ہم آہنگ نہیں ہو سکتی۔

موجودہ زمانے میں طب اور سرجری میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے، یہ خیال کیا جانے لگا ہے کہ سائنس موت اور بڑھاپے کے سوا ہر جسمانی تکلیف پر قابو پا سکتی ہے، مگر اسی کے ساتھ بیماری کی اقسام میں نہایت تیزی سے ایک نئے نام کا اضافہ ہو رہا ہے ـــــ اعصابی بیماری Nervous Diseases یہ "اعصابی بیماریاں" کیا ہیں، یہ دراصل اسی تضاد کا ایک عملی ظہور ہے، جس میں جدید سوسائٹی شدت سے مبتلا ہے، مادی تہذیب نے انسان کے اس حصّے کو جو نمکیات معدنیات اور گیسوں کا مرکب ہے، ترقی دینے کی کافی کوشش کی، مگر انسان کا وہ حصّہ جو شعور، خواہش اور ارادہ پر مشتمل ہے اس کی غذا سے اس کو محروم کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ پہلا حصہ تو بظاہر فربہ اور خوش منظر دکھائی دینے لگا، مگر دوسرا حصّہ جو اصل انسان ہے، وہ طرح طرح کے عوارض میں مبتلا ہو گیا۔

موجودہ امریکہ کے بارے میں وہاں کے ذمہ دار ذرائع کا اندازہ ہے کہ وہاں کے بڑے بڑے شہروں میں اسّی فیصدی مریض ایسے ہیں جن کی علالت بنیادی طور پر نفسیاتی سبب Psychic Causation کے تحت واقع ہوتی ہے، ماہرین نفسیات نے اس سلسلے میں جو تحقیقات کی ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان بیماریوں کے پیدا ہونے کے چند اہم ترین وجوہ یہ ہیں، جرم، ناراضگی، اندیشہ، پریشانی، مایوسی، تذبذب، شبہ، حسد، خود غرضی اور اکتاہٹ (Boredom) یہ سارے عوارض، اگر گہرائی کے ساتھ غور کیجئے تو بے خدا زندگی کا نتیجہ ہیں، خدا پر ایمان آدمی کے اندر وہ اعتماد پیدا کرتا ہے، جو مشکلات میں اس کے لئے سہارا بن سکے، وہ ایسا برتر مقصد اس کے سامنے رکھ دیتا ہے، جس کے بعد وہ چھوٹے چھوٹے مسائل کو نظر انداز کر کے اس کی طرف بڑھ سکے، وہ اس کو ایسا محرک دیتا ہے، جو سارے اخلاقی محاسن کی واحد بنیاد ہے، وہ عقیدے کی وہ طاقت دیتا ہے، جس کے متعلق ڈاکٹر سر ولیم اوسلر Sir William Osler نے کہا ہے "وہ ایک عظیم قوت محرکہ (Great Moving Force) ہے جس کو نہ کسی ترازو میں تولا جا سکتا ہے اور نہ لیبورٹری میں اس کی آزمائش کی جا سکتی" یہی عقیدے کی طاقت دراصل نفسیاتی صحت کا خزانہ ہے، جو نفسیات اس سرچشمہ سے محروم ہو وہ "بیماریوں"

کے سوا کسی اور انجام سے دوچار نہیں ہوسکتی، یہ انسان کی بدقسمتی ہے کہ وقت کے ماہرین نے نفسیاتی یا اعصابی عوارض کا کھوج لگانے میں تو کمال درجہ کی ذہانت کا ثبوت دیا ہے، مگر ان نودریافت بیماریوں کا صحیح علاج تجویز کرنے میں وہ سخت ناکام ہوئے ہیں، ایک عیسائی عالم کے الفاظ میں "نفسیاتی علاج کے ماہرین (Psychiatrists) صرف اس تالے کی باریک تفصیلات بتانے میں اپنی کوشش صرف کررہے ہیں، جو ہمارے اوپر صحت کے دروازے بند کرنے والا ہے"

۱۵ جدید معاشرہ بیک وقت دو متضاد عمل کررہا ہے، ایک طرف وہ مادی سازوسامان فراہم کرنے میں پوری قوت صرف کررہا ہے، دوسری طرف مذہب کو ترک کرکے وہ حالات پیدا کررہا ہے، جس سے زندگی طرح طرح کے عذاب میں مبتلا ہوجائے، وہ ایک طرف دوا کھلا رہا ہے، اور دوسری جانب زہر کا انجکشن دے رہا ہے، یہاں میں ایک امریکی ڈاکٹر ارنسٹ اڈولف (Paul Ernest Adolph) کا ایک اقتباس نقل کروں گا جو اس کے سلسلے میں ایک دلچسپ شہادت فراہم کرتا ہے:۔

"جن دنوں میں میڈیکل اسکول میں زیرِ تعلیم تھا، میں ان تبدیلیوں سے آگاہ ہوا جو زخم ہوجانے کی صورت میں جسم کے اخلاط (Body Tissues) میں رونما ہوتی ہیں، خوردبین کے ذریعہ نسیجوں کا مطالعہ کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ نسیجوں پر مختلف موافق اثرات کے واقع ہونے سے زخم کا اطمینان بخش اندمال ہوجاتا ہے، اس کے بعد جب تعلیم ختم کرکے میں عملاً ڈاکٹری کے پیشے میں داخل ہوا تو مجھے اپنے اوپر بڑا اعتماد تھا کہ میں زخم اور اس کے اندمال کے طریقوں کو اس حد تک جانتا ہوں کہ میں یقینی طور پر موافق نتیجہ پیدا کرسکتا ہوں جبکہ میں اس کے ضروری طبی وسائل مہیا کرکے اس کو استعمال میں لاؤں، لیکن جلد ہی میری اس خود اعتمادی کو صدمہ پہنچا، مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اپنی میڈیکل سائنس میں ایک ایسے عنصر کو نظرانداز کردیا تھا جو سب سے زیادہ اہم ہے ـــــ یعنی خدا۔

اسپتال میں جن مریضوں کی نگرانی میرے سپرد کی گئی ان میں ایک ستر سال کی بوڑھی عورت تھی،

جس کا کولھا زخمی ہو گیا تھا، اکسرے تصاویر کے معائنہ سے معلوم ہوا کہ اس کی نسجیں (Tissues) بڑی تیزی سے ٹھیک ہو رہی ہیں، میں نے اس سرعت کے ساتھ شفایابی پر اس کو مبارکباد پیش کی، انچارج سرجن نے مجھے ہدایت کی کہ اس خاتون کو ۴۸ گھنٹے میں رخصت کر دیا جائے، کیونکہ اب وہ کسی سہارے کے بغیر چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی ہے۔

اتوار کا دن تھا، اس کی بیٹی ہفتہ وار ملاقات کے معمول کے مطابق اسے دیکھنے آئی، میں نے اس سے کہا کہ چونکہ اس کی ماں اب صحت یاب ہے، اس لئے وہ کل آ کر اسے اسپتال سے گھر لے جائے، لڑکی اس کے جواب میں کچھ نہیں بولی اور سیدھی اپنی ماں کے پاس چلی گئی، اس نے اپنی ماں کو بتایا کہ اس نے اپنے شوہر سے اس کے بارے میں مشورہ کیا ہے، اور یہ طے ہوا ہے کہ وہ اس کو اپنے گھر نہ لے جا سکیں گے، اس کے لئے زیادہ بہتر انتظار کی صورت یہ ہے کہ اس کو کسی دار الضعفاء (Old People's Home) میں پہنچا دیا جائے۔

چند گھنٹوں کے بعد جب میں اس بڑھیا کے پاس گیا تو میں نے دیکھا کہ بڑی تیزی کے ساتھ اس پر جسمانی انحطاط طاری ہو رہا ہے، چوبیس گھنٹے کے اندر ہی وہ مر گئی — کولھے کے زخم کی وجہ سے نہیں بلکہ دل کے صدمے کی وجہ سے (Not of her broken hip, but of a broken heart)

ہم نے ہر قسم کی ممکن طبی امداد اسے پہنچائی، مگر وہ جانبر نہ ہو سکی، اس کے کولھے کی ٹوٹی ہوئی ہڈی تو بالکل درست ہو چکی تھی، مگر اس کے ٹوٹے ہوئے دل کا کوئی علاج نہ تھا، وٹامن، معدنیات اور ٹوٹی ہوئی ہڈی کو اپنی جگہ لانے کے لئے سارے ذرائع استعمال کرنے کے باوجود وہ صحت یاب نہیں ہوئی، یقینی طور پر اس کی ہڈیاں جڑ چکی تھیں، اور وہ ایک مضبوط کولھے کی مالک ہو چکی تھی، مگر وہ بچ نہ سکی، کیوں، اس لئے کہ اس کی صحت کے لئے اہم ترین عنصر جو درکار تھا، وہ وٹامن نہیں تھا، نہ معدنیات تھے اور نہ ہڈیوں کا جوڑنا تھا، یہ صرف امنگ (Hope) تھی، اور جب زندگی کی امنگ ختم ہو گئی تو صحت بھی رخصت ہو گئی۔

اس واقعہ نے مجھ پر گہرا اثر کیا ہے، کیونکہ اس کے ساتھ مجھے یہ شدید احساس تھا کہ اس بوڑھی

خاتون کے ساتھ ہرگز یہ حادثہ پیش نہ آتا، اگر یہ خاتون خدائی امید (God of Hope) سے آشنا ہوتی، جس پر ایک عیسائی کی حیثیت سے میں اعتقاد رکھتا ہوں"۔

[The Evidence of God, p. 212-14]

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ جدید ترقی یافتہ دنیا کس قسم کے تضاد سے دوچار ہے، وہ ایک طرف سارے علوم کو اس نہج پر ترقی دے رہی ہے، جس سے خدا کا وجود حرف غلط ثابت ہو جائے، تعلیم و تربیت کے پورے نظام کو اس ڈھنگ سے چلایا جا رہا ہے، جس سے خدا اور مذہب کے احساسات دلوں سے رخصت ہو جائیں، اس طرح روح ــــ اصل انسان ــــ کو موت کے خطرے میں مبتلا کر کے اس کے جسم ــــ مادی وجود ــــ کو ترقی دینے کی سعی کی جا رہی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ عین اس وقت جبکہ بہترین ماہرین اس کی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے میں کامیابی حاصل کر چکے ہوتے ہیں، عقیدے کی اندرونی طاقت کی محرومی کی وجہ سے اس کا دل ٹوٹ جاتا ہے، اور بظاہر جسمانی صحت کے باوجود وہ موت کے آغوش میں چلا جاتا ہے۔

یہی وہ تضاد ہے، جس نے آج پوری انسانیت کو تباہ کر رکھا ہے، خوش پوش جسم حقیقی سکون سے محروم ہیں، عالی شان عمارتیں اجڑے ہوئے دلوں کا مسکن ہیں، جگمگاتے ہوئے شہر جرائم اور مصائب کا مرکز ہیں، شان دار حکومتیں اندرونی سازش اور بے اعتمادی کا شکار ہیں، بڑے بڑے منصوبے کردار کی خامی کی وجہ سے ناکام ہو رہے ہیں ــــ غرض مادی ترقیات کے باوجود زندگی بالکل اجڑ گئی ہے، اور یہ سب نتیجہ ہے صرف ایک چیز کا ــــ انسان نے اپنے خدا کو چھوڑ دیا، اس نے اس سرچشمہ سے اپنے آپ کو محروم کر دیا، جو اس کے خالق و مالک نے اس کے لئے مہیا کیا تھا۔

نفسیاتی امراض کی نوعیت جو اوپر بیان کی گئی ہے، وہ اتنی واضح حقیقت ہے کہ خود اس فن کے علماء نے اس کا اعتراف کیا ہے، نفسیات کے مشہور عالم پروفیسر ینگ (C.G. Jung) نے اپنی زندگی بھر کا تجربہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"پچھلے تیس برسوں میں روئے زمین کے تمام متمدن ممالک کے لوگوں نے مجھ سے (اپنے نفسیاتی امراض کے سلسلے میں) مشورہ حاصل کرنے کے لئے رجوع کیا ہے، میرے مریضوں میں زندگی کے نصف آخر میں پہونچنے والے تمام لوگ ——— جو کہ ۳۵ سال کے بعد کہی جاسکتی ہے ——— کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس کا مسئلہ اپنے آخری تجزیے میں زندگی کا مذہبی نقطۂ نظر پانے کے سوا کچھ اور ہو، یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان میں سے ہر شخص کی بیماری یہ تھی کہ اس نے وہ چیز کھودی تھی جو کہ موجودہ مذاہب ہر دور میں اپنے پیروؤں کو دیتے رہے ہیں، اور ان مریضوں میں سے کوئی بھی حقیقۃً اس وقت تک شفایاب نہ ہوسکا، جب تک اس نے اپنا مذہبی تصور دوبارہ نہیں پالیا"[1]

یہ الفاظ اگرچہ سمجھنے والے کے لئے بجائے خود بالکل واضح ہیں، تاہم اگر میں نیویارک اکیڈمی آف سائنس کے صدر اے. کریسی مارلین کے الفاظ نقل کردوں تو بات بالکل مکمل ہوجائے گی:

"ادب و احترام، فیاضی، کردار کی بلندی، اخلاق، اعلےٰ خیالات اور وہ سب کچھ جس کو خدائی صفات (Divine Attributes) کہا جاسکتا ہے، وہ کبھی الحاد سے پیدا نہیں ہوسکتیں جو کہ دراصل خود بینی کی عجیب و غریب قسم ہے، جس میں آدمی خود اپنے آپ کو خدا کے مقام پر بٹھا لیتا ہے، عقیدے اور یقین کے بغیر تہذیب تباہ ہوجائے گی، نظم، بےنظمی میں تبدیل ہوجائے گی، ضبط نفس اور اپنے آپ پر کنٹرول کا خاتمہ ہوجائے گا ——— اور برائی ہر طرف پھیل جائے گی، ضرورت ہے کہ ہم خدا پر اپنے یقین کو دوبارہ مضبوط کریں"

Man Does not Stand Alone, p, 123

---

[1] Quoted by C.A. Coulson, *Science and Christian Belief*, p. 110

آخری بات

اگر کسی دن ماونٹ پیلومر کی رصدگاہ سے یہ اعلان ہو کہ زمین کی قوتِ کشش ختم ہو گئی ہے تو ساری دنیا میں کہرام مچ جائے گا، کیوں کہ اس خبر کے معنی یہ ہیں کہ زمین کا پورا کرہ چھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کی طرف کھنچنا شروع ہو جائے اور چند ہفتوں کے اندر سورج کے عظیم الاؤ میں اس طرح جا گرے کہ اس کی راکھ بھی یہ بتانے کے لئے باقی نہ رہے کہ زمین نام کی کوئی چیز کبھی اس کائنات میں موجود تھی، جس میں اربوں انسان بستے تھے، اور بڑے بڑے تمدنی شہر آباد تھے۔

مگر ماہرینِ اعداد و شمار کی یہ خبر کہ ہر ایک منٹ میں ساری دنیا کے اندر ایک سو انسان مر جاتے ہیں، ہمارے لئے اس سے بھی زیادہ گھبرا دینے والی بات ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک رات اور دن میں تقریباً پندرہ لاکھ انسان ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں ـــــ ۲۴ گھنٹے میں پندرہ لاکھ!

اس صورتِ حال میں یہ واقعہ مزید شدت پیدا کر دیتا ہے کہ پندرہ لاکھ کا یہ انتخاب تابکار عناصر کے برقی ذرات کی طرح بالکل نامعلوم طور پر ہوتا ہے کوئی بھی شخص یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اگلے چوبیس گھنٹے کے لئے جن پندرہ لاکھ انسانوں کی موت کی فہرست تیار ہو رہی ہے، اس میں اس کا نام شامل ہے یا نہیں، گویا ہر شخص ہر آن اس خطرے میں مبتلا ہے کہ قضا و قدر کا فیصلہ اس کے حق میں موت کا فرشتہ بن کر آ پہنچے۔

یہ جانے والے لوگ کہاں جاتے ہیں، اس کا جواب آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ کائنات کے مالک کے سامنے اپنے کارنامۂ زندگی کا حساب دینے کے لئے حاضر کئے جاتے ہیں، انھیں اس لئے موت آتی ہے کہ دوسری دنیا میں ان کی وہ مستقل زندگی شروع ہو جو دنیا کے عمل کے مطابق اچھی یا بری انھیں گزارنی ہے، یہ زندگی

یا تو بے حد آرام کی زندگی ہے' یا بے حد تکلیف کی زندگی، یہ گھڑی بہرحال آکر رہے گی، ہم سب لوگ ایک ایسے ممکن انجام سے دوچار ہیں جس سے ہم صرف بچنے کی فکر کر سکتے ہیں، اس کے آنے کو ہم ٹال نہیں سکتے۔

پھر انسان تو کس انتظار میں ہے، کیا تجھ کو ہوشیار کرنے کے لئے یہ واقعہ کافی نہیں کہ تو اپنے آپ کو موت سے نہیں بچا سکتا، کیا تجھے اپنی زندگی کو بدلنے کے لئے اس سے بڑے کسی محرک کی ضرورت ہے کہ اگر تو نے دنیا میں اپنی زندگی نہیں بدلی تو تجھ کو جہنم کی آگ میں ہمیشہ ہمیش کے لئے جلنا ہے' کیا تو اس سے نہیں ڈرتا کہ دنیا میں جب تیری قبر پر تیرے معتقدین پھول چڑھا رہے ہوں تو آخرت میں خدا کے فرشتے تیری باغیانہ روش کے جرم میں تجھ پر کوڑے برسائیں۔

وہ دن جو بڑا سخت دن ہوگا، وہ جب آئے گا تو سارے زمین و آسمان کو الٹ دے گا، وہ ایک نئی دنیا بنائے گا، جہاں سچ سچ کی شکل میں ظاہر ہوگا اور جھوٹ جھوٹ کی شکل میں کوئی نہ خود دھوکے میں رہے گا، اور نہ دوسرے کو دھوکا دے سکے گا، نہ کسی کا زور چلے گا، نہ سفارش کام آئے گی، اس دن تیرے الفاظ کے گھروندے بکھر جائیں گے، تیرے جھوٹے فلسفے بے دلیل ثابت ہوں گے، تیری فرضی امیدیں تجھے دھوکا دے دیں گی، تیرا اقتدار تیرے کچھ کام نہ آئے گا، تیرے خود ساختہ بت تجھے جواب دے دیں گے، آہ! انسان کس قدر بے سہارا ہوگا اس روز، حالانکہ اسی دن اس کو سب سے زیادہ سہارے کی ضرورت ہوگی، وہ کتنا محروم ہوگا، اس روز، حالانکہ اسی دن وہ سب سے زیادہ پانے کا محتاج ہوگا۔

انسان! آج ہی سن لے، کیونکہ کل تو سنے گا مگر اس وقت تیرا سننا بے کار ہوگا، آج ہی سوچ لے کیونکہ موت کے بعد تو سوچے گا مگر اس وقت کا سوچنا تجھے کچھ کام نہ آئے گا، خدا کا راستہ تیرے سامنے کھلا ہوا ہے' اس کو پکڑ لے، خدا کے رسول پر ایمان لا، خدا کی کتاب کو اپنی زندگی کا دستور بنا، آخرت کے دن کے لئے تیاری کر —— یہی تیری کامیابی کا راستہ ہے، اسی میں وہ زندگی چھپی ہوئی ہے، جس کی تجھے تلاش ہے۔

زیرِنظر کتاب کا ترجمہ دنیا کی اکثر بڑی زبانوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اسلامی دنیا کی اکثر یونیورسٹیوں میں وہ مطالعہ کے نصاب میں داخل ہے۔ سیکڑوں کی تعداد میں اخبارات ورسائل نے اپنے تبصروں میں اس کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ مسلم دنیا کے مشہور ترین عربی اخبار الاہرام (قاہرہ) نے اپنے ۲ جولائی ۱۹۷۳ کے شمارہ میں اس پر جو مفصل تبصرہ کیا تھا، اس کا آخری پیراگراف یہ تھا ——

مصنفِ کتاب نے اسلام کے مطالعہ کا ایسا علمی انداز اختیار کیا ہے جو بالکل انوکھا ہے۔ جدید مادی فکر کے مقابلہ میں دین کو وہ اسی طرزِ استدلال سے ثابت کرتے ہیں جس سے منکرین اپنے نظریات کو ثابت کرتے ہیں۔ اسلام کے ظہور سے لے کر اب تک چودہ سو سالوں میں اسلام پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اگر تاریخ کو چھانا جائے اور اللہ کی طرف بلانے والی عمدہ کتابوں کو چھلنی سے چھان کر نکالا جائے تو یہ کتاب بلاشبہ ان میں سے ایک ہوگی۔

ISBN 81-85063-28-1
9 788185 063287
Rs. 65

Al-Risāla